جہانِ غالب
19
Ga

جہانِ غالب

یادگار حکیم عبدالحمیدؒ

جلد: 10　　شمارہ۔19

نگراں

پروفیسر شمیم حنفی

مدیر

ڈاکٹر عقیل احمد

غالب اکیڈمی، بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی

جہانِ غالب

یادگار حکیم عبدالحمیدؒ

جلد:10 شمارہ:19 دسمبر2014 تا مئی2015ء

قیمت فی شمارہ:-/20 روپے

قیمت سالانہ:-/40 روپے

ڈاک سے: -/50 روپے

کمپوزنگ: بشریٰ بیگم

طابع و ناشر

ڈاکٹر عقیل احمد

سکریٹری: غالب اکیڈمی

بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی۔110013

فون نمبر:9868221198, 24351098

ای میل:ghalibacademy@rediffmail.com

ویب سائٹ:www.ghalibacademy.org

ISSN -2349-0225

پرنٹر، پبلشر ڈاکٹر عقیل احمد نے غالب اکیڈمی کی طرف سے شیروانی آرٹ پرنٹرس 1480 گلی حکیم اجمل خاں، بلیماران، نئی دہلی سے چھپوا کر غالب اکیڈمی 168/1 بستی حضرت نظام الدین نئی دہلی 13 سے شائع کیا۔ ایڈیٹر: عقیل احمد

فہرست

اس شمارے میں

جہان غالب کا انیسواں شمارہ پیش خدمت ہے۔ اکیڈمی کی ادبی سرگرمیوں میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ بڑے پروگراموں کے ساتھ ساتھ چھوٹی نشستوں اور مذاکروں پر بھی توجہ دی جا رہی ہے۔ اردو کے فروغ کی کوششیں جاری ہیں لیکن اس میں خاطر خواہ اضافہ دکھائی نہیں دے رہا ہے جہان غالب کے قاری محدود ہیں کشمیر اور مہاراشٹر میں تو اس کے قاری ہیں لیکن دہلی اور اتر پردیش میں ہم اردو والوں تک نہیں پہنچ سکے ہیں۔ اس شمارے میں بھی اکیڈمی کے سیمناروں میں پڑھے گئے مقالے شامل ہیں۔

پہلا مقالہ پروفیسر عبدالحق صاحب کا غالب کے ہم معنی اردو فارسی اشعار ہے۔ یہ بہت وقیع اور دلچسپ ہے اس کا آخری جملہ یہ ہے ''اشعار و اسالیب کے اعادہ کے ساتھ غالب کی لفظیات اور تراکیب میں بھی اشتراک وارتباط کی مختلف صورتیں سخن شناسی کے لیے درمان خیال کو دعوت نظر دیتی ہیں۔

دوسرا مقالہ غالب کی دلی پروفیسر قاضی جمال حسین صاحب کا ہے جس میں عہد غالب کی تہذیبی و معاشرتی بدحالی غالب کی تخلیقات کے ذریعے دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ تیسرا مضمون ڈاکٹر خالد علوی کا غالب کی دلی اور غالب کی دلی والے ہے۔ جس میں غالب کے بیانات کو حقائق کی چھلنی میں چھان کر اس عہد کی مبہم تصویر سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ چوتھا مضمون ڈاکٹر حنا آفرین کا خطوط غالب کی روشنی میں دلی کے تاریخی حالات ہے۔ جس میں خطوط غالب کی اہمیت پر خاص توجہ دی گئی ہے اسے تاریخ و تہذیب کی دنیا سے جوڑنے والا بتایا گیا ہے۔

پانچواں مضمون عہد غالب میں دہلی کی خانقاہیں شامل ہے جو خاصا طویل بھی اور معلوماتی بھی ہے۔ چھٹا مضمون غالب اور مومن: مفروضات اور حقائق معید رشدی کا ہے جس میں غالب اور مومن کے رشتے کو دوستی کے پس منظر میں دیکھا گیا ہے اور مومن کے کلام کو نئی بصیرتوں اور وسائل کی روشنی میں پڑھنے اور پرکھنے پر زور دیا گیا ہے۔ آخر میں جناب فیروز بخت کا بازیابیِ حویلی غالب کی داستان ہے۔ غالب کے مزار اور غالب کے مکان کو بہتر بنانے کی جو صورت پیدا ہوئی اس کے واحد محرک فیروز بخت صاحب ہیں انھوں نے مزار کے سلسلے میں اور حویلی کے لیے خاص طور پر طویل جدوجہد کی اس کے بعد ہی حویلی میں میوزیم قائم ہوسکا۔ ان کا مضمون تحریک دینے والا ہے۔ اس کے ساتھ کتابوں کی باتیں اور غالب اکیڈمی کی چند ادبی سرگرمیوں کا ذکر ہے۔

امید ہے کہ یہ شمارہ بھی قارئین پسند کریں گے۔

✿✿✿
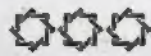
اس شمارے کے قلم کار:

(1) پروفیسر عبدالحق (سابق صدر شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی)

(2) پروفیسر قاضی جمال حسین (شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی)

(3) ڈاکٹر خالد علوی (ڈاکٹر ذاکر حسین کالج، نئی دہلی)

(4) ڈاکٹر حنا آفرین (جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی)

(5) پروفیسر غلام یحییٰ انجم (ہمدرد یونیورسٹی، نئی دہلی)

(6) جناب فیروز بخت (ذاکر نگر، نئی دہلی)

(7) جناب معید رشیدی (اے ایم یو، علی گڑھ)

پروفیسر عبدالحق

غالب کے ہم معنی اردو فارسی اشعار

اگر لسانی معجزات کی فہرست بنائی جائے تو اقبال و غالب اس میں ضرور شامل ہوں گے۔ ان کی فنی عظمتوں سے قطع نظر ان کا ذولسان ہونا کسی تخلیقی اعجاز سے کم نہیں ہے۔ اس سے بھی بڑی حیرت کی بات یہ ہے کہ فارسی دونوں کی مادری زبان نہیں ہے۔ اقبال کے لیے تو فارسی اردو دونوں غیر مادری ہیں۔ مگر دونوں کو زبانوں پر اظہار کی بے پناہ قوت حاصل ہے۔ ان دونوں کی شہرت کا مدار اردو پر ہے اگرچہ دونوں نے فارسی کو ہی ترجیح دی ہے۔ غالب کے نزدیک مجموعہ اردو بے رنگ وفروتر ہے۔ فارسی شاعری کو پڑھنے کی تاکید ہے۔ ہاں کلیات میں ایک جگہ اردو کے عرضِ ہنر کا اعتراف ہے۔

اے کہ میراث خوار من باشی　　　　اندر اردو کہ آں زبانِ فن ست

اقبال بھی گیسوئے اردو کو منت پذیر شانہ ہی سمجھتے رہے وہ بھی زبور عجم پڑھنے کی تاکید کرتے ہیں۔ نوائے راز کی ترجمانی کے لیے فارسی کو ترجیح دیتے رہے۔ اشاعت، اشعار وافکار کے اعتبار سے بھی دونوں کے یہاں فارسی کو بھرپور وزن اور وقعت حاصل ہے۔ فنی شان وشکوہ میں بھی وہ سر بلند ہیں۔ اس حقیقت کے باوجود ان کی فارسی شاعری کے اعتراف کے لیے ہمارا انتقادی شعور ابھی تک متحمل نہیں ہوسکا ہے۔ غالب کا فارسی کلام اردو سے تقریباً چھ گنا ضخیم ہے، یعنی گیارہ ہزار سے زائد اشعار کا گنجینۂ گراں بہا ہے۔

غالب نے اردو کلام کو انتخاب و اختصار کے عمل سے بھی گزارا ہے۔ اقبال نے بھی تقریباً چالیس فی صد اردو کلام کو متداول مجموعوں سے حذف کیا ہے۔ بڑے قلم کاروں کی تخلیقی نظر کی یہ

نمایاں خصوصیت رہی ہے۔ ان کے انتخابی شعور کی کارفرمائی ہے۔ پستی و بلندی کے معائر مقرر ہوتے رہے ہیں۔ خود ان کا تنقیدی شعور ایسا پختہ اور پاکیزہ تھا کہ آج ہماری بصیرتوں میں اضافے کا باعث بنے ہیں۔ دونوں دو زبان شاعر ہیں۔ خیال کا دونوں زبانوں میں در آنا ایک فطری عمل ہے۔ دونوں کے یہاں یہ صورت موجود ہے۔ موضوع غالب سے متعلق ہے۔ اس پر تفصیل سے گفتگو مقصود ہے سردست کلام اقبال سے صرف ایک مثال پیش کررہا ہوں۔ زبور عجم کی 48ویں غزل سے پہلے کہی گئی بعد میں کم وبیش وہی خیال بال جبریل میں دہرایا گیا ہے۔

فرصت کشمکش مدہ ایں دل بیقرار را یک دو شکن زیادہ کن گیسوئے تاب را

بال جبریل کی تیسری غزل کا مطلع ملاحظہ ہو۔

گیسوئے تاب دار کو اور بھی تاب دار کر ہوش وخرد شکار کر قلب ونظر شکار کر

اقبال کی تخلیقات میں اور بھی مثالیں موجود ہیں۔ ان کی پیامی اور فکری شاعری میں انہیں التباس یا ابلاغ کا منطقی اور قابل قبول جواز ہے۔ جب افکار کا ارتکاز یا وحدتِ فکر موجود ہو تو عربی وعجمی کے دل کشا وسیلوں میں فرق نہیں ہوتا۔ پھر بھی حیرت ہوتی ہے کہ وحدت افکار کے باوجود ترسیل وترجمانی میں آہنگ کے انواع بہت مختلف ہیں۔ اسی لیے مطالعۂ اقبال میں دونوں زبانوں کی آگہی لازمی ہے۔

تفہیم غالب کے لیے یہ طریقِ نظر مستحسن ضرور ہے مگر ملزوم نہیں۔

لیکن غالب کے افکار وتصورات پر گفتگو کے دوران ان کی تمام تحریروں کا مطالعہ اور حوالہ ناگزیر ہوگا۔ نثری تحریریں خواہ کسی صورت میں ہوں ان کی افادیت سہ چند ہوجاتی ہے۔ مثلاً ان کے وجودی یا صوفیانہ خیالات کی تفہیم کے لیے خطوط وتقریظ بھی بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ اس کا بھی امکان رہتا ہے کہ شعری تحریر کے استناد کے لیے نثری تحریریں موثر اور کارگر ہوجاتی ہیں مثلاً ماضی پرستی کے بارے میں غالب کا فارسی قول ہے:

''ہرکس کہ شد صاحب نظر دین بزرگاں خوش نکرد'' اس کی تصویب وتائید کے لیے سرسید کی

کتاب پر لکھا گیا منظوم مقدمے کا یہ قول دوسری حتمی دلیل فراہم کرتا ہے کہ وہ ماضی پرستی کو نامبارک گردانتے ہیں۔

مردہ پروردن مبارک کار نیست

یوں بھی کسی فن کار کی تمام تخلیق کو خاطر میں لائے بغیر ہر عمل تنصیف کے تقاضے سے محروم ہی قرار پائے گا۔ اگر چہ وہ اپنی شیخی شاعری کے منکر بھی نظر آتے ہیں، قصیدے کا مصرع ہے۔

شیخی و شاعری نہ سزاوارِ شان ماست

(فخر اور فن میری شان کے خلاف ہے)

اس مضمون میں سرقہ یا توارد سے صرف نظر کر کے فارسی و اردو کے ہم خیال چند اشعار کا ذکر ہے۔ یہ مذکورہ اصطلاحات معانی ومفاہم کے لحاظ سے ہمارے دائرے تحریر سے الگ ہیں۔ کیوں کہ ایک ہی شاعری کے کلام میں ہم معنی اشاعر کو توارد نہیں کہہ سکتے تکرار تشابہت۔ ہم معنی یا ہم خیال کہنا زیادہ موزوں ہے، ایک ہی زبان میں کہے گئے اشعار میں بھی معنی کی مشابہت ممکن ہے۔ اردو کے کئی فن کاروں کی تخلیقات میں تکرارِ خیال موجود ہے ویسے بھی بڑے قلم کاروں کے زاویۂ اظہار میں بڑی وسعت ہوتی ہے۔ خیالات دہرانا بھی ایک حقیقت بن جاتی ہے۔ یہ تخلیق کا ایک لاشعوری عمل ہوتا ہے اسے خیال کی ترجمانی بھی کہہ سکتے ہیں۔ ایک زبان کا خیال کسی دوسری زبان میں منتقل ہونا ترجمہ کہلائے گا۔ یہ بھی مختلف التوع ہوسکتا ہے۔

فارسی ادب سے استفادے میں غالب کا کوئی بھی حریف سنگ پیدا نہ ہوسکا۔ کلیات میں ظہوری انوری، نظیری، حافظ وسعدی غالب و بیدل وغیرہ کا بار بار اعتراف کیا گیا ہے۔ اسلاف کے تصورات کا تخیل میں شامل ہونا بشری خمیر کا حصہ ہے۔ غالب کے معترضین نے سرقہ کے الزام کے وقت اس حقیقت سے چشم پوشی کی۔ غالب کی پر شوخ طبیعت کو جواب دینا پڑا۔

مبر گمانِ توارد یقین شناس کی دزد متاع من زنہاں خانہ ازل بردست

غالب کے مرغِ تخیل کی بلند پروازی سے یہی امید تھی۔ پوری شاعری میں سرقے کے اتہام

کے لیے ''درزی و بکف چراغ داری'' کی ایسی مثال نہیں ملتی ایک اور جگہ کہتے ہیں۔

نگویم تازہ دارم شیوۂ جادو بیانان را　　ولے در خویش بینم کارگر جادوے آنان را

(میں دعویٰ نہیں کرتا کہ سحر نگار بزرگ قلم کاروں سے میرا کلام تازگی و طرفگی میں آگے ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ اسلاف کی جادو نگاری کے موثرات مجھ میں ضرور موجود ہیں۔) غالب کے فکر وشعور کی بلند پروازی میں ان کی شوخی کو بڑا دخل ہے۔

یہ شعر بھی اسی کا مظہر ہے۔ یہ ایک طرح کا تجزیہ ہے۔ ورنہ غالب کے دعوائے سخن دانی میں سبقت رکھنے والے بھی خال خال نظر آئیں گے۔ کلیات کے مقدمہ کا تسلیم شدہ جملہ ملاحظہ ہو۔

''ہر آئینہ رفتگاں سرخوش غنودہ اند و من خرابستم'' (کلیات فارسی صفحہ 24)

بزرگوں کی تخلیقات پر جھاڑو پھیرنے والے بھی غالب ہی ہیں۔

خشک ست کشتِ شیوۂ تحریر رفتگاں　　سیرابش از نم رگِ ابر قلم کنم

(بزرگوں کے اسالیب فن کی کھیتیاں خشک ہو چکی تھیں۔ میں نے اپنے ابر قلم کی نمی سے انھیں سیراب کیا ہے) غالب کے فخریہ اظہار میں بھی کوئی ان کا ہمسر نہیں ملے گا۔

کلام غالب میں ہم خیال اشعار کی بڑی تعداد ہے۔ بعض دوستوں نے ان کی نشان دہی کی ہے۔ ان خیالات کا توادر یا اعادہ ایک فطری سچائی ہے۔ جو فنی گرفت سے ماورا ہے۔ فن کار ایک ہے۔ زبانیں دو ہیں۔ دونوں میں پرتو خیال کا در آنا تخلیقی فعلیت کے عین موافق ہے۔ اردو کا شعر ہمارے حافظے میں ہے۔

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں　　موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

اس سے ملتا جلتا خیال ملاحظہ ہو۔

شادی و غم ہمہ سر گشتہ تراز یک دگراند　　روز روشن بہ وداع شب تار آمد و رفت

یہ ترجمہ نہیں ہے مضمون یا خیال کی ترجمانی ہے۔ فکری اسالیب کے تخلیقی سرچشمے ہیں الفاظ کے بیش و کم کے ساتھ تقریباً وہی خیال یہاں بھی موجود ہے۔ یعنی رنج و راحت باہم ایک دوسرے کے

ساتھ ہیں۔ روز روشن کے ساتھ شب تاریک کا سلسلہ تکوینی نظام کی سرشت میں ہے۔ مسرتوں کی موجودگی میں الم کا سورہ بھی جزوِ کتابِ زندگی ہے۔

غالب کو اپنے فن کی رفعتوں کا شدید احساس ہے جو بے جا بھی نہیں۔ انہوں نے جگہ جگہ ان بلندیوں کا فخریہ اظہار کیا ہے۔ فارسی میں یہ قول انتقادی اظہار کی مثال ہی نہیں محاورہ کی حیثیت سے معروف ہے۔

در شعر سہ تن پیمبر آنند — ہر چند کی لا نبیؑ بعدی
ابیات وقصیدہ و غزل را — فردوسی وانوری وسعدی

غالب کا اظہار خودستائی کی تمام سرحدوں کو پامال کرتا ہے۔ مگر ندرتِ بیان اور شوخی مزاج کی بلندی و برنائی کے ساتھ۔

گر شعر و سخن بدہر آئیں بودے — دیوان مرا شہرت پرویں بودے
غالب اگر ایں فن سخن دیں بودے — آں دیں را ایزدی کتاب ایں بودے

اگر دنیا میں شعروسخن کا آئیں نافذ ہوتو کلام غالب کو الہامی کتاب کی حیثیت دی جائے گی۔ یہ ڈاکٹر بجنوری نہیں خود غالب کا اقرار ہے ان اشعار سے قطع نظر تحلیقی دروں بینی کے بارے میں غالب کا یہ خیال ہماری تنقیدی میں قول فیصل بن چکا ہے۔ جسے ہم نے بے چوں وچرا تسلیم کر لیا ہے۔

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے — جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آئے

لفظ کو گنجینۂ معنی کا طلسم قرار دے کر انہوں نے قاری متن اور تنقید کی موجودہ گمراہی کی تمام ادعائیت کی نفی کی ہے۔ اس اساسی خیال کو پیش نگاہ رکھیں تو فارسی کے اس ماخذ کی داد دے سکیں گے۔ اردو کے مذکورہ مطلع سے پہلے یہ شعر موجود ہے۔

آتش کدہ ہے سینہ مرا راز نہاں سے — اے وائے اگر معرض اظہار میں آئے
درتہ ہر حرف غالب چیدہ ام میخانہ — تاز دیوانم کہ سرمست سخن خواہد شدن

عجیب بات ہے کہ مقطع کے آخری مصرعے کو غالب نے دانستہ طور پر مطلع کا پہلا مصرع بھی قرار دیا ہے۔ گویا اس خیال کی پسندیدگی کی تکرار تحت الشعور کی دل فریب بازگشت ہے۔ ایک ہی غزل کا مصرع مکرر مستعمل ہے۔

تازدیوانم کہ سرمست سخن خواہد شدن اول بھی ہے اور آخر بھی جب غالب کے ہر حرف کی تہ میں میخانے آباد ہوں تو ان کی سرمستی سرشاری کی ارزانی سے ہر ایک لطف اندوز ہوگا۔ غالب نے فارسی میں سخن گوئی کو رگ گفتار سے خون جگر کی کشید کہا ہے گویا خون جگر کی نمود و کشید پر اقبال نے تخلیق کے معجزات کی دنیائے فکر آباد کی ہے۔ بیش و کم کے ساتھ تقریباً یہی خیال غالب کے اردو کلام میں حرف وصوت اور ندرتِ بیان کی دنیائے دیگر کے ساتھ موجود ہے۔

یہی بار بار جی میں مرے آئے ہے کہ غالب　　کروں خوان گفتگو پر دل و جاں کی میہمانی

خوان گفتگو پر دل و جان کو قربانی کے بغیر لذت انسباط کا امکان ممکن نہیں ہے۔ غالب نے اپنے سومناتِ خیال کے اندر جھانکنے کی جگہ جگہ تاکید کی ہے۔

بسومناتِ خیالم درآ می تابینی

توارد خیال کا درآنا غزالان افکار کے ہجوم کے موثرات ہیں۔ غالب کے کلام میں افکار کی کہکشاں فروزاں ہے۔ معانی کے فراواں بیان اور انداز نگارش کے اسالیب مختلف ہیں۔ ان میں توارد یا تسامح یا معنی ہم آہنگ ہوجانا ایک فطری عمل ہے۔ یہ کہنا بھی ذرا مشکل ہے کہ فارسی خیال سے اردو خیال مستعر یا مستفیض ہے یا اس کے برعکس صورت بھی ممکن ہے۔

خیال کی ہم آہنگی کی ایک دوسری مثال پر بھی نظر رکھنی چاہیے۔ زبانوں کے اختلاف سے قطع نظر فارسی کلام میں بھی ایسے ہم خیال اشعار موجود ہیں۔ گنجینۂ معنی کا طلسم یا درتہِ ہر حرف غالب کا ذکر ہو چکا ہے۔ نعتیہ قصیدے میں اس ترکیب اور خیال کو ملاحظہ فرمائیں ۔

گو ہر کدۂ راز بود عالم معنی　　وز لفظ گہر ریزہ بود و اوئی آں را

لفظ کہن و معنی نودر ورق من　　گوئی کہ جہاں ست و بہاراست جہاں را

الفاظ پرانے ہیں مگر معنیٔ نو کی ارزانی دیکھنی ہو تو کلام غالب سے رجوع کیجیے جو عالم میں ابر بہارنم کر ذرہ زمین کو زر بکف کر رہا ہے۔ اشعار کے علاوہ مختلف مصرعوں میں تکرار خیال کی مثالیں بھی بہت ہیں۔ غزل کا ایک فارسی مصرع مثال کے طور پر ملاحظہ ہو۔

مینائے مے از تندئی ایں مے بگدازد

اردو کا مصرع ہے

آبگینہ تندئی صہبا سے پگھلا جائے ہے

غالب کے فنی محاسن اور تخلیقی تموج کے مطالعہ میں یہ شعر اکثر حوالہ بنتا ہے۔

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں

فارسی شعر امیں خیال کا دوسرا مصدر ہے۔ اظہار میں ندرت ہے۔ الفاظ کا اختلاف ہے مگر معانی کا سرچشمہ نمود ایک لگتا ہے۔ براہ راست اعادہ نہ سہی لیکن دوسرا مصرع قریب تر محسوس ہوتا ہے۔

مانبودیم بدیں مرتبہ راضی غالب　　شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد فن ما

یہ بھی ایک عجوبہ ہے کہ اردو کی ہی نہیں دنیائے شعر میں شاید ہی کسی صنف سخن کو اردو غزل جیسی شہرت حاصل ہو۔ اس کا موضوع بھی مخصوص ومحدود ہے۔ قید وبند کے باوجود اس نے وسعت اور پہنائی خیال کے بے کراں امکانات روشن کیے ہیں۔ مندرذیل شعر کے متن ومعانی کو دیکھیں تو اشتراک خیال کے زیادہ سے زیدہ زاویے نظر آئیں گے۔ عاشق کی مشتاقی اور محبوب کی بیزاری کا گلہ راہ محبت میں عام ہے۔ دوسرے مصرے ذرا مختلف ہیں۔ مگر حیرت واستعجاب کا اظہار دوئی سے دور ہے۔

ما با تو آشناؤ تو بیگانہ زما　　آخر تو؛ خدا کہ جہانے گواہ گیست

یا

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار　　یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

غالب کی آزاد خیالی اور وسیع المشربی پر خاص توجہ صرف کی گئی ہے ان کی مذہبی فکر سے ارادتاً اغماض برتا گیا ہے۔ ان کی مجموعی فکر کے خاک وخمیر میں ایمان وعقیدے کی روح خون رواں کی طرح موجزن ہے۔ موجود ونا موجود پر ان کا متکلمانہ کلام زیر بحث رہا ہے لیکن عقیدۂ رسالتؐ پر غالب نے کسی بحث کا شائبہ نہیں رکھا۔ ربوبیت کے ساتھ رحمت اللعالمین کو ارض وسما میں جاری کر کے انہوں نے ذرہ برابر بھی شبہے کی گنجائش نہیں رکھی۔ آنحضرتؐ کی ذات گرامی سے والہانہ وارفتگی کا اندازہ ان کے نعتیہ قصیدوں سے ہوتا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ شعری روایت کے برخلاف محبت

سے سرشار نعتیہ غزل لکھی جو فارسی اور اردو کی نعتیہ شاعری میں بہت ممتاز اور منفرد مقام کی حامل ہے۔ خاص طور پر مقطع میں حضور رسالت مآبؐ کی عظمت کا جو اعتراف ہے وہ سیرتِ نبویؐ کا مہتم بالشان موضوع ہے ایک دوسری حیرت فروز مثال اردو غزل کا مقطع ہے۔

اس کی امت میں ہوں میں میرے رہیں کیوں کام بند واسطے جس شہؐ کے غالب گنبد بے در کھلا

نعت کی تخلیق عالیہ میں کئی جگہ معراج بنویؐ کا فکر انگیز تذکرہ ہے اردو شعر کے دوسرے مصرعے کو ذہن میں رکھیے تو حسب ذیل مصرع بہت حد تک معانی کی قربت کا احساس دلائے گا۔

کز چاک بود خندہ بر افلاک کتاں را

اور بھی اشعار گفتگو کا موضوع بن سکتے ہیں۔ لیکن ان سے صرف نظر کیا جا رہا ہے کیوں کہ پاس طوالت مانع ہے۔ صرف غزل کے اشعار پر توجہ ہے۔ فارسی غزل کا شعر ہے۔

ہر ذرہ محوِ جلوۂ حسن یگانہ ای ست گوئی طلسم شش جہت آئینہ خانہ ای ست

غالب کے مشہور اردو قصیدے کے مطلع پر توجہ درکار ہے۔

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

اردو کا دوسرا اہم مضمون شعر دیکھیے

صد جلوہ رو بہ رو ہے جو مژگاں اٹھائیے طاقت کہاں کہ دید کا احسان اٹھائیے

مِن ،عن مفہوم نہ سہی مگر تلمیح کی ایک توسعی صورت ملاحظہ ہو۔

در عرض. دعوے لیلی نکو ہے بر زعم غالبؔ مجنوں ستائے

عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے مرا کام مجنوں کو برا کہتی ہے لیلیٰ مرے آگے

غالب صوفی نہ تھے مگر تصوف کے دقیق مسائل علمیہ پر نظر رکھتے تھے اردو سے زیادہ فارسی اشعار میں نکتہ سرا ہیں۔ قطرہ و دریا، ذرہ و مہر، بود و نبود، وحدت و کثرت، عیان وانا الحق، خودی و بے خودی، ذات وصفات کے شعری تلازمے کثرت سے ملتے ہیں۔ اردو میں یہ مصرع عام و خاص کی زبان پر جاری ہے۔

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا یا قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے

فارسی غزل میں ہے۔

سرمایۂ ہر قطرہ کہ گم گشت بہ دریا — سود یست کہ ما نزبزین ست وزیاں نیست

فارسی کا یہ شعر غزل کی روایت کا شاہ کار بن چکا ہے

وداع و وصل جداگانہ لذت دارد — ہزار بار برو، صدہزار بار بیا

اردو میں باندازِ دگر یہ مضمون ملاحظہ ہو۔

آغوشِ گل کشودہ برائے وداع ہے — اے عندلیب، چل کہ چلے دن بہار کے

دوسرا مصرع بھی قابلِ توجہ ہے۔

ہے وصل ہجر عالمِ تمکین و ضبط میں

ایک مصرع ہے۔

بس کہ تاب نگاہ تو ز آسودن رفت

اردو کا مصرع ہے۔

بخشے ہے جلوۂ گل ذوقِ تماشا غالب

فارسی کا مصرع ہے۔

فدائے روئے تو عمر ہزار سالۂ ما

اردو میں یہی آرزو اس طرح ہے۔

مرے عدو کو یارب ملے میری زندگانی

فارسی میں ہے۔

سوز دزبسکہ تابِ جمالش نقاب را

اس کا بدل اردو میں یہ ہوسکتا ہے۔

کیوں جل گیا نہ تابِ رخِ یار دیکھ کر

اردو کا بہت مشہور شعر ہے۔ جو ایک تکوینی نظام کے ضابطے کی دلیل ہے۔

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی — ہیولا برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

فارسی میں خیال کی ترجمانی کا پرتو نظر آئے گا۔لفظیات میں بھی ایک اشتراک ہے۔

سرمایہ کرامت کن وانگاہ بغاوت بر — برخرمن ما برقے برمزرع باراں شو

ارض وسما میں انسانی وجود حقیقت ابدی سے آشنا ہے اور سب سے مکرم ومحترم بھی ہے۔ وہی ہنگامہ ہائے شوق کا محور ہے۔ اسی کی سرگرمیوں سے یہ خرابہ آباد ہے۔

زما گرمست ایں ہنگامہ بنگر شورِ ہستی را　　قیامت می دمد از پردۂ خاکے کہ انساں شد

قدرے تبدیل کے ساتھ خیال کی ترجمانی اردو میں بھی موجود ہے۔

ہے آدمی بجائے خود اک محشر خیال　　ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

دوسرے شعر میں معنوی قربت کی دوسری مثال زیدہ خیال افروز ہے۔

جلوہ زارِ آتش دوزخ ہمارا دل سہی　　فتنۂ شور قیامت کس کی آب وگل میں ہے

یا　　رتبے میں مہر وماہ سے کم تر نہیں ہوں میں

ایک دوسرے فارسی شعر میں ملتا جلتا مفہوم اردو شعر میں منتقل ہوسکا ہے۔ الفاظ اور اندازِ بیان مختلف سہی مگر روح خیال بہت حد تک موجود ہے۔

ناز مومن و کافر برچہ دستگاہ آخر　　سبحہ و مسوا کے قشقہ وزنا رے

اردو شعر ملاحظہ ہو

زنار باندھ سبحۂ صد دانہ توڑ ڈال　　رہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر

ایک دوسری غزل کا شعر بھی اسی زمرے میں لایا جا سکتا ہے طرز ادا ذرا مختلف ہے۔ اس مفہوم کو اردو غزل میں طرح طرح سے پیش کیا گیا ہے، ملتیں مٹنے پر اجزائے ایماں میں تبدیل ہوجاتی ہیں۔

آئین برہمن بہ نہایت رساندہ ایم　　غالب بیا کہ شیوۂ آزر کنم ما

فارسی کے اس شعر کو متضاد خیال کا حاصل کہا جا سکتا ہے۔

خودراز سرد مہریٔ اسلامیان شہر　　در حلقۂ پرستشِ آذر گرفتہ ایم

اردو میں ایک اور شعر قابل توجہ ہے

ں کچھ سبحہ وزنار کے پھندے میں گیرائی　　وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے

غالب نے وفاداری۔ استوار کو اصل ایمان قرار دیا ہے۔ مضمون آفرینی میں ایک شعری

اسلوب کا کثرت سے استعمال بھی ہوتا رہا ہے شاعر ایک ہی موضوع میں بنیادی موضوع کو پیش کرتا ہے دوسرے مصرع میں دلیل فراہم کرتا ہے یا تشبیہ کا علاقہ پیدا کرتا ہے۔ یا نفسِ مضمون کو زیادہ مستحکم اور دلاویز بنانے کے لیے علامتوں، استعاروں یا پیکروں کا بھی سہارا لیتا ہے۔ بات ایک مصرع پر ہی موقوف ہوتی ہے۔ دوسرا مصرع شعر کی تکمیل کے لیے تخلیق کیا جاتا ہے۔ مکمل مفہوم والے مصرع ملاحظہ ہوں۔

وقت است کہ پیانہ جوئے رواں کند

ہیں بس کہ جوشِ بادہ سے شیشے اچھل رہے

اردو میں ایک دوسرا مصرع بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔

شیشۂ مے، سرو سبز، جوئے بار نغمہ ہے۔

فارسی کا مصرع اس طرح ہے۔

ندارد حاجت لعل و گہر حسنِ خداداد دوست

یا

نازم فروغ بادہ زعکسِ جمالِ دوست

یہ نہ سہی مگر خداداحسن کی جلوہ سامانی یہ بھی ہے،

حسن بے پروا خریدار متاع جلوہ ہے

اردو میں ایک شعر خیال کی ارتفاعیت سے ہم کنار ہے۔

نظارہ کیا حریف ہو اس برق حسن کا　　جوشِ بہار جلوے کو جس کے نقاب ہے

فارسی کا یہ فکر انگیز شعر نظام عالم پر غور کرنے کے لیے دعوت دیتا ہے۔

التفات شبنم وخورشید تابان دیدہ ام　　جرأتِ باید کہ حرف شوق دیدارش کنم

اردو کا شعر دیکھیے۔

پرتو خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم　　میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

نفس موضوع میں تکرار کے اندیشوں کا گمان بہت تھا۔ لیکن تنوع اور توسیع طلبی نے اسے بہت محفوظ رکھا، بزرگوں کے اکتساب سے استفادہ کرتے ہوئے انفرادیت کو بحال رکھنا کوہ کنی سے کم نہیں۔ غالب و اقبال نے اسلاف سے استفادے کی راہ کہکشاں کو کشادگی بخشی ہے۔ مگر ان کی انفرادیت میں کوئی بھی شریکِ سخن نہیں ہے۔ ندرتِ بیان سے انھیں انفرادیت حاصل ہے۔

استفادے کے آئین مرتب کئے گئے ہیں۔ دوسرے فن کاروں کے خیالات کو ہو بہو منظوم کرنے کو سرقہ کہہ کر معیوب قرار دیا گیا۔ اپنے موضوع کے مختلف اظہار کو تکرارِ لفظی و معنوی سے تعبیر کیا گیا۔ جب کہ دوسروں کے خیال کا لاشعوری طور پر در آنا توارد کے ذیل میں آتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک عہد اور ایک معاشرہ میں رہنے والے معاصرین کے درمیان فکر و احساس کی یکسانیت کا ہونا عین فطری ہے۔ اگر چہ اسے کلیہ نہیں کہا جا سکتا۔ معاشرتی تنقید کی تعبیریں یہاں موثر نہیں ہو پاتیں۔ خود عہد غالب ایک مثال ہے۔ غالب بڑے شاعر اور ضخیم کلام کے مالک ہیں۔ ذولسان ہونے کے ساتھ اظہار میں کہیں کہیں یکسانیت کا پایا جانا قرینِ قیاس و التباس ہے۔ مثالیں ملاحظہ ہوں۔

بخودی کردہ سبک دوش فراغے دارم کوہِ اندوہ رگِ خوابِ گراں است مرا

اردو کا یہ شعر کافی حد تک خیال کے قریب لگتا ہے۔

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چا ہیے

صد فی صد خیال نہ سہی مگر مفہوم کی قربت اظہار کے دوسرے پیرایۂ بیان میں موجود ہے۔ دوسرے اشعار ملاحظہ ہوں۔

شیوۂ زندان بے پروا خرام از من مپرس ایں قدر دانم کہ دشوار ست آسان زیستن

اردو کا مشہور شعر بہت حد تک قربت رکھتا ہے۔

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آسان ہونا آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

فارسی غزل کا ایک شعر ہے جو در مدح خود کی مثال ہے۔

غالب نوائے کلک تو دل من بردزدست　　تا پردہ سنج شیوۂ انشائے کیستی؟

مشہور اردو شعر اس خیال سے کسی حد تک ہم آہنگ ہے۔

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے　　کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

حریفِ منت احباب نیستم غالب　　خوشم کہ کار فن از سعی چارہ گر گزرد

اردو کا حسب ذیل شعر بہت معروف ہے۔فارسی شعر سے کافی قریب محسوس ہوتا ہے۔

دردمنت کش دوا نہ ہوا　　میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا

فارسی اور اردو میں مماثلت کی ایک دوسری مثال ملاحظہ ہو۔راقم کا ذاتی خیال ہے کہ فارسی اظہار سے اردو شعر کا مفہوم اور پیرایۂ بیان زیادہ پراثر ہے اور یہ اکثر و بیشتر دیکھنے میں آتا ہے۔

سوزد زبسکہ تاب جمالش نقاب را　　دانم کہ درمیاں نہ پسند وحجاب را

اردو شعر کو اس خیال کا بہت حد تک متبادل کہا جا سکتا ہے۔

جب وہ جمال دل فروز صورتِ مہر نیم روز　　آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے میں منہ چھپائے کیوں

ناچیز نے کلیاتِ فارسی سے کافی اشعار نشان زد کئے ہیں جن میں خیال کا توارد ہے۔یا تسامح یا تکرار اور التباس بھی۔ان اشعار میں بہت حد تک قطعیت کے ساتھ توارد نہ سہی مگر قرین خیال موضوعات موجود ہیں۔جو مطالعہ میں بہت ممتاز نہ سہی مگر کسی حد تک مفید معلوم ہوتے ہیں۔ ذولسان شاعر غالب کی تخلیق راز جوئی میں یہ اشارے سنگ نشاں کا کام دے سکتے ہیں۔ہم خیال مضامین کا مطالعہ بھی غالبیات کا ایک ناگزیر حصہ ہے۔کلام غالب میں اسلاف کے خیالات کی نشان دہی ایک دوسرا موضوع مطالعہ ہے۔

اس طرح سے نہ جانے کتنے موضوعات ہیں جو غالب کے اسالیب فکر وفن میں اپنی رفعتوں کے ساتھ موجود ہیں۔ اشعار و اسالیب کے اعادہ کے ساتھ ساتھ لفظیات اور تراکیب میں بھی اشتراک و ارتباط کی مختلف صورتیں سخن شناسی کے لیے درمان خیال کو دعوت نظر دیتی ہیں۔

✿✿✿

پروفیسر قاضی جمال حسین

غالب کی دلّی

ہندوستان کی تہذیبی تاریخ میں 19ویں صدی کا نصف آخر سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ مغلوں کے مستحکم اور طویل سیاسی اقتدار نے اسی عرصے میں آخری سانسیں لیں اور حرف غلط کی طرح صفحۂ ہستی سے نابود ہوگئی۔ اورنگ زیب سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک، قلعہ معلّیٰ میں جو کچھ ہوا، سازشوں درشیہ دوانیوں کے جو عبرت ناک واقعات پیش آئے، ان کی تفصیل تاریخ کی کتابوں میں محفوظ ہے۔ البتہ سیاسی بساط کی اس تبدیلی نے ہماری ادبی اور تہذیبی تاریخ کا رخ ہی تبدیل کردیا۔ ہماری تہذیبی ترجیحات اور اخلاقی اقدار کا دیرینہ نظام درہم برہم ہوگیا۔ دہلی کی ادبی محفلیں آداب معاشرت اور تہذیبی مظاہر دیکھتے دیکھتے قصۂ پارینہ بن گئے۔ دہلی کے اجڑنے اور پھر آباد ہونے کے فیصلے تو کاتب تقدیر نے بارہا کیے، لیکن 57ء میں پیش آنے والے واقعات اتنے دوررس اور کثیر الجہات تھے کہ معاشرت اور معیشت کے تمام ادارے اس کی زد پر تھے۔ انگریزوں کی فتح کا پرچم دہلی کی فقط سیاسی بساط پر ہی بلند نہیں ہوا بلکہ مشرقی تہذیب اور علوم وفنون کا پورا شیرازہ ہی بکھر گیا۔

غالب کے خطوں میں براہ راست اور اشعار میں بالواسطہ، مٹتی ہوئی اس مغلیہ تہذیب کا نوحہ جابجا سنا جاسکتا ہے۔ اس تہذیب کے رخصت ہونے کا، غالب کو جو رنج تھا اور بے بسی کا جو شدید احساس تھا وہ ان کی نثر ونظم میں، موجِ تہ نشیں کی طرح موجود ہے۔ ملال کی اس کیفیت نے ان کی شوخی اور ظرافت میں بھی افسردگی کا رنگ شامل کرکے اسے زہر خند میں تبدیل کردیا ہے اپنی بے بسی پر ہنسنے اور ملال کو نشاطیہ اسلوب میں جذب کردینے کا غالب کو غیر معمولی سلیقہ تھا۔

غالب کے احباب کا حلقہ، قلعہ معلّیٰ سے لے کر ہندوستان کے مختلف امرا اور نوابین تک پھیلا ہوا ہے۔ شاعروں اور ادیبوں کے علاوہ علوم وفنون کے سربرآوردہ لوگوں کی ایک دنیا ہے۔ جو ان کے خطوں میں آباد ہے۔ غالب کے مکتوب الیہم میں ہر فرقے اور مذہب کے لوگ شامل ہیں پھر ان خطوں میں

جن لوگو کے نام آتے ہیں اور جس تعلق اور اپنائیت سے غالب ان کے احوال دریافت کرتے ہیں اگر اسے بھی حساب میں شامل کریں تو غالب کے رسم وراہ کی فہرست بہت طویل ہو جاتی ہے۔

عہد غالب کی تہذیبی تاریخ کا بنیادی ماخذ تو خود غالب کے خطوط اور ان کی دوسری تحریریں ہیں۔ میر مہدی مجروح کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"اس چرخ کی رفتار کا برا ہو۔ ہم نے اس کا کیا بگاڑا تھا، ملک ومال، جاہ وجلال کچھ نہیں رکھتے تھے۔ ایک گوشہ وتوشہ تھا۔ چند مفلس و بے نوا، ایک جگہ فراہم ہو کر کچھ ہنس بول لیتے تھے۔

سو بھی نہ تو کوئی دم دیکھ سکا اے فلک
اور تو یاں کچھ نہ تھا ایک مگر دیکھنا

یاد رہے یہ شعر خواجہ میر درد کا ہے۔

غالب کے خطوط جلد دوم 508 مرتبہ خلیق انجم"

"وہ صحبتیں اور تقریریں جو یاد کرتے ہو اور تو کچھ بن نہیں آتی، مجھ سے خط پر خط لکھواتے ہو۔ آنسوؤں پیاس نہیں بجھتی۔ یہ تحریر تلافی اس تقریر کی نہیں کر سکتی۔ بہر حال کچھ لکھتا ہوں۔ دیکھو کیا لکھتا ہوں۔" 508 ص 509۔ اپریل 1959

چرخِ کم رفتار کا یہ شکوہ غالب کے ملال کی سچی تصویر ہے۔ غالب کے احباب کی بزم جو 1957ء کے بعد تاریخ کا حصہ بن گئی غالب کے حافظے میں جا گزیں ہے اور مختلف پیرایوں میں ان کے ذہن کے پردے پر ابھرتی ہے۔ احباب کے تئیں محبت کے اظہار کا یہ انوکھا اسلوب بھی دیدنی ہے۔ انھیں میر مہدی مجروح کو ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں۔

"او میاں سید زادۂ آزادہ، دلی کے عاشق دلدادہ، ڈھے ہوئے اردو بازار کے رہنے والے حسد سے لکھنو کو برا کہنے والے، نہ دل میں مہر و آزرم، نہ آنکھ میں حیا و شرم، نظام الدین ممنوں کہاں، ذوق کہاں، مومن خاں کہاں، ایک آزردہ سو خاموش، دوسرا غالب وہ بے خود و مدہوش، نہ سخن وری رہی نہ سخن دانی، کس برتے پر تتا پانی، آئے دلی وائے دلی، بھاڑ میں جائے دلی" خط نمبر 32 ص 565 23 مئی 1861

ایک یاد ہے جو پیچھا نہیں چھوڑتی، بار بار ذہن کے پردے پر ابھرتی ہے اور دلی کی محفلوں کو

بھولنے کی ہر کوشش تمام ناکام ثابت ہوتی ہے۔

نیچرل شاعری کے علم برادر اور پیرویٔ مغربی کے اہم مبلغ خواجہ حالی نے بھی دہلی مرحوم کا مرثیہ لکھا ہے۔ فقط چند اشعار سنیے، عہد غالب کی تصویر آنکھوں میں پھر جائے گی، شعرو شاعری کی پرانی محفلوں کے بکھر جانے کا غم ہر شعر سے ظاہر ہوتا ہے۔

تذکرہ دہلی، مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ — نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز
صحبتیں اگلی مصور ہمیں یاد آئیں گی — کوئی دلچسپ مرقع نہ دکھانا ہرگز
چپے چپے پہ ہیں یاں گوہر یکتانہ خاک — دفن ہوگا نہ کہیں اتنا خزانہ ہرگز
غالب و شیفتہ ومیر و آزردہ و ذوق — اب دکھائے گا یہ شکلیں نہ زمانہ ہرگز
مومن وعلوی وصہبائی وممنون کے بعد — شعر کا نام نہ لے گا کوئی دانا ہرگز
داغ ومجروح کو سن لو کہ پھر اس گلشن میں — نہ سنے گا کوئی بلبل کا ترانہ ہرگز
رات آخر ہوئی اور بزم ہوئی زیروزبر — اب نہ دیکھو گے کہیں لطفِ شبانہ ہرگز

عہد غالب کا امتیاز یہ ہے کہ معاشرت اور آدابِ زیست میں 1857ء کے بعد جو تبدیلیاں رونما ہوئیں اور جس سرعت سے ہوئیں اس کی مثال تاریخ میں کم ملتی ہیں۔ یہ ایک عبوری دور تھا جس میں مغربی تہذیب نے ہندوستان کے فکری نظام پر دوررس اثرات مرتب کئے، مغلیہ تہذیب کے ڈوبتے ہوئے سورج کے ساتھ ہی، مغربی نظامِ فکر کا آفتاب تازہ بھی افق پر نمودار ہوتا تھا۔ ایک ذہنی کشمکش تھی۔ صدیوں پرانی جمی جمائی بساط کے الٹنے کا غم اور بیزاری کے باوجود نئی تہذیب کو قبول کرنے کی مجبوری۔ جذبے اور عقل کی آویزش کے نقوش اس عہد کے ادبی سرمایہ میں جابجا دیکھنے کو ملتے ہیں۔ غالب کے خطوط تو اس عہد کی تہذیبی تاریخ کی دستاویز ہیں۔ غالب کے دیوان میں بھی ایسے اشعار کی کمی نہیں جن کی معنویت اس خونیں انقلاب کے پس منظر میں مزید روشن ہوجاتی ہے۔ یہ اشعار دیکھئے۔

ہے موجزن اک قلزمِ خوں کاش یہی ہو — آتا ہے ابھی دیکھئے کیا کیا مرے آگے
ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے — اک شمع ہے دلیل سحر سو خموش ہے

ان اشعار کو اگر دہلی مرحوم کا مرثیہ کہا جائے تو کچھ غلط نہ ہوگا۔ حزن وملال میں ڈوبے یہ اشعار بھی سنیئے۔

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط　　دامان باغبان وکف گل فروش ہے
لطفِ خرام ساقی و ذوق صدائے چنگ　　یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے
یا صبح دم جو دیکھیے آکر تو بزم میں　　نے وہ سرور وسوز نہ جوش وخروش ہے
داغِ فراق محبت شب کی جلی ہوتی　　اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

خطوط غالب کا کوئی صفحہ کھولیے۔کوئی خط پڑھیے۔دہلی اور اہل دہلی پر گزرنے والی قیامت کی کوئی تصویر دیکھنے کو ضرور مل جائے گی۔مولانا عباس رفعت کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''میں قابل کسی ستائش کے نہیں ہوں۔ایک ماتم زادۂ بےنوائے گوشہ نشیں ہوں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام باآنکہ نبی تھے اور نفس مطمینہ رکھتے تھے۔ایک فرزند کے فراق میں اتنا روئے کہ نابینا ہوگئے۔اس طغیان قلزم جو کہ میرے ہزار معشوق ایسے ڈوب کہ ان کا پتہ نہیں ملتا کہ کیا ہوگئے ہزار آدمی کا ماتم دار ہوں۔چالیس چالیس پچاس پچاس برس کے یار بچھڑ گئے۔کوئی مجھ کو باپ کہتا تھا کوئی مرشد جانتا تھا۔

سب کہاں کچھ' لالہ گل میں نمایاں ہوگئیں　　خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں
یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں　　لیکن اب نقش ونگارِ طاق نسیاں ہوگئیں

غالب نے اپنی آنکھوں سے دلی کے اچھے اور برے دونوں دن دیکھے تھے لیکن یہاں رونق تھی چہل پہل تھی،فرصت اور فراغت کے دن تھے۔خوش دلی اور خوش مذاقی اہل دہلی کا شیوہ تھا۔راجا سے پرجا تک،انس ویگانگت کے رشتے میں پروئے ہوئے تھے۔انگریزوں کے قبضے کے بعد تو جیسے دہلی ختم ہی ہوگئی۔تاریخ کا حصہ بن گئی۔میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں۔

''بھائی کیا پوچھتے ہو کیا لکھوں،دلی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر تھی۔قلعہ معلی چاندنی چوک ہر روز بازار جامع مسجد کا،ہر ہفتے سیر جمنا کے پل کی،ہر سال میلہ پھول والوں کا،یہ پانچوں باتیں اب نہیں،پھر کہو دلی کہاں؟ ہاں کوئی شہر قلمرو میں اس نام کا تھا''

514 خطوط غالب جلد دوم مرتبہ خلیق انجم

لیکن خط میں دہلی کے کوؤں کا حالی اس طرح بیان کرتے ہیں جیسے ان کے بند ہو جانے سے تہذیب کی بڑی نشانی مٹ گئی۔یہ کوئیں دہلی کا شناختی نشان تھے۔اس خط میں شہر کے درودیوار اور

کوچہ و بازار کا حال غالب نے ایسی دلسوزی سے بیان کیا ہے کہ ہر لفظ سے ان کے دل کا درد بے ساختہ جھلک اٹھتا ہے۔ شہر کی ایک ایک جگہ کو اس کے نام سے اس طرح یاد کرتے ہیں جیسے اپنے گھر کے در و دیوار کا ماتم کر رہے ہوں۔ سارا منظر یک لخت آنکھوں کے سامنے گھوم جاتا ہے۔ سنئے۔

''مصیبتِ عظیم یہ ہے کہ قاری کا کنواں بند ہوگیا۔ لال ڈگی کے کوئیں یک قلم کھاری ہوگئے خیر کھاری ہی پانی پیتے، گرم پانی نکلتا ہے۔ پرسوں میں سوار وہاں کوؤں کا حال معلوم کرنے گیا تھا، مسجد جامع ہوتا ہوا راج گھاٹ دروازے کو چلا۔ مسجد جامع سے راج گھاٹ دروازے تک بے مبالغہ ایک صحرا لق و دق ہے۔ اینٹوں کے ڈھیر جو پڑے ہیں وہ اگر اٹھ جائیں تو ہو کا مکان ہوجائے۔ یاد کرو مرزا گوہر کے باغیچے کے اس جانب کئی بانس نشیب تھا اب وہ باغیچے کے صحن کے برابر ہوگیا۔ یہاں تک کہ راج گھاٹ کا دروازہ بند ہوگیا۔ کشمیری دروازے کا حال تم دیکھ گئے ہو۔۔۔۔ پنجابی کٹرہ، دھوبی واڑہ، رام جی گنج، سعادت خاں کا کٹرہ، رامن جی داس گودام والے کے مکانات، صاحب رام کا باغ، حویلی ان میں سے کسی کا پتہ نہیں ملتا۔ قصہ مختصر شہر صحرا ہوگیا ہے۔۔۔۔ ارے بندہ خدا ، اردو بازار نہ رہا۔ اردو کہاں دلی کہاں واللہ اب شہر نہیں ہے، کمپ ہے، چھاونی ہے۔ نہ قلعہ نہ شہر نہ بازار نہ نہر۔''

خط نمبر 31 خطوط غالب جلد دوم 524 مرتبہ خلیق انجم

انگریزوں کے قبضے سے پہلے اگر دہلی کی اجتماعی زندگی کا منظر دیکھتا ہوں تو راشد الخیری، فرحت اللہ بیگ، ناصر نذیر فراق اور ہمارے زمانے میں سید ضمیر حسن دہلوی کی تحریریں پڑھیے، ضمیر حسن دہلوی کی زبان سے جون کے مہینے میں دہلی کی ایک جھلک دیکھیے۔

''چھلکارا، کٹورا بجاتا چلا آتا ہے۔ میاں آبِ حیات پلاؤں؟ صابر صاحب کے کوئیں کا ہے۔ آپ ذرا ٹھٹھکے اور اس نے برنجی کٹورے میں ٹھنڈا برف سا پانی پیش کردیا۔ پانی پیا، پیسہ دیا اور آگے بڑھ گئے۔ لو وہ گنڈوالا چلا آتا ہے۔ خمیرے کی لپٹیں اڑ رہی ہیں۔ کمر پر چمڑے کا تھیلا ہے جس میں تمباکو اور کوئلہ ہے۔ ایک ہاتھ میں بڑا سا حقہ ہے خوب تازہ کیا ہوا۔ اس پر موتیا کے گجرے لپٹے ہوئے ہیں۔ چلم پر سرپوش جما ہوا ہے۔ سرے پر چاندی کی منہال، جس میں زنجیروں کا گچھا لٹکا ہوا ہے۔ میاں شربت کے گھونٹ آرہے ہیں۔

دھواں اڑایا، پیشہ نکر ہاتھ پر رکھا اور آگے بڑھ گئے۔ سیڑھیوں پر پہنچے تو گرما گرم پکوان اتر رہے ہیں، لونگ چڑے، قلمی بڑے، تنی کے کباب، پانی کی پھلکیاں الگ الگ قرینے سے لگے ہیں۔ انگاروں پر کلیجی اور دل کے ٹکوں کی سیخیں سنک رہی ہیں۔ کہیں وہ کباب بنتے ہیں جنھیں دیکھ کر ثقہ لوگوں کے منہ میں پانی آجائے۔ واہ کیا لطف ہے کھائیے نہ کھائیے، خوشبو سے دل سیر ہوا جاتا ہے۔''

مقدمہ دلی کی آخری بہار از سید ضمیر حسن دہلوی 20

انھیں کی زبانی دلی کی طوائفوں سے بھی ملتے چلیے۔

''ایرے غیرے نتھو خیرے ان کی دلیز پر قدم نہیں رکھ سکتے تھے۔ صرف جانے پہچانے شرفا ان کے ہاں جایا کرتے تھے۔ گھنٹہ دو گھنٹہ بیٹھے۔ شائستہ گفتگو ہوئی۔ شعروشاعری بولی ٹھولی ہنسی مذاق سے جی بہلایا گیا۔ خیال ٹھمری، دادرا، غزل گائی جاتی تھی۔ جبھی تو دلی کے اگلے شرفا اپنے بچوں کی پرانی طوائفوں کے اخراجات کا یہ عالم تھا کہ بڑے بڑے رئیس ان کے اصطبل کا خرچہ بھی نہیں اٹھا سکتے تھے۔''

دہلی کا تہذیبی اثاثہ دیکھنا ہے تو اشرف صبوحی کی کتاب دلی کی چند عجیب ہستیاں پڑھیے، میر باقر علی داستان گو سے سنیئے، گھمی کوابی کی بامحاورہ اردو سنیئے، مرزا چپاتی کے مشغلے دیکھیے۔ یہ وہ لوگ ہیں جس سے دہلی کی تہذیب عبارت تھی۔ بہ قول اشرف صبوحی، کوئی فن ہو اصل میں قدردانی کی گود میں پرورش پاتا ہے۔ قلعہ آباد تھا۔ امرا کی ڈیوڑھیاں برقرار تھیں، ملک گیری اور ملک داری والے تو خلد آشیاں اور جنت مکان ہو چکے تھے۔ لباس کی تراش خراش ہوتی یا دسترخوان کی زیبائش درزی اپنی کاری گریاں دکھاتے۔ باورچی نان بائی رکاب دار، طرح طرح کی استادیوں سے کھانے کے اقسام بڑھاتے، انعام پاتے۔ بادشاہت اجڑی، اہل کمال دربدر کی ٹھوکریں کھا کر، بازاروں میں نکل پڑے۔ پیٹ بری بلا ہے، کیسی آن اور کس کی شان، کوئی کبابی بن گیا، کسی نے نہاری کی دوکان کھول لی''۔ دلی کی چند عجیب ہستیاں 77

دہلی کی تہذیبی قدریں وقت کے ہاتھوں نابود ہو گئیں اور برطانوی اقتدار کا پرچم بلند ہوتا چلا گیا۔ غالب، عاقبت اندیش اور روشن خیال آدمی تھے۔ انھیں بہت جلد اس بات کا یقین ہو گیا کہ مغلیہ

تہذیب اب قصہ پارینہ ہے۔ لہٰذا وقت کی حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے، نئے آئین سے پیمانِ وفا باندھنے میں انھوں نے زیادہ وقت نہیں لیا۔

مجبوریٔ و دعوائے گرفتاریٔ الفت دستِ تہ سنگ آمدہ پیمان وفا ہے

انگریزوں کی شان میں قصیدے لکھے ان سے رسم و راہ پیدا کی، اور ان کے نظامِ زیست کی برکتوں کا برملا اعتراف کیا۔ ابوالفضل کی آئین اکبری پر غالب نے جو منظوم تقریظ لکھی تھی وہ سرسید کو پسند نہیں آئی چنانچہ سرسید نے اسے کتاب کے ساتھ شائع نہیں کیا۔ غالب نے اس میں اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ صاحبان انگلستان نے اپنی ٹکنالوجی اور علم کی مدد سے وہ کچھ کر دکھایا جس کا تصور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ انگریزوں نے خس و خاشاک سے آگ پیدا کر دی۔ بھاپ سے پانی پر کشتی چلا دینا، کسی افسوں سے کم نہیں اور سب پر مستزاد یہ کہ بغیر مضراب کے انھوں نے ساز سے نغمہ پیدا کر دیا۔ سیکڑوں کوس کی آواز تار کے ذریعہ آن کی آن میں ہم تک انھیں کی برکتوں سے پہنچ جاتی ہے۔ غرض آئین اکبری کی تدوین بے وقت کی راگنی ہے۔ اب تو نئی روشنی میں دنیا کو دیکھنے اور اس کی برکتوں سے لطف اندوز ہونے کا وقت ہے۔

مردہ پروردن مبارک کار نیست خود بگو کار نیز جز گفتار نیست

یہ تقریظ نئی روشنی میں حقائق کو دیکھنے اور قبول کرنے کا اعتراف نامہ ہے۔ پرانی تہذیب تقویم پارینہ ہو چکی ہے۔ قلعہ معلٰی کی رونقیں اور کوچہ و بازار کی چہل پہل اب فقط یادوں کا حصہ ہے۔ اک دھوپ تھی جو ساتھ گئی آفتاب کے۔ سچ ہے کہ۔

فلک زمین و ملائک جناب تھی دلی بہشت و خلد سے بھی انتخاب تھی دلی

جواب کا ہے کو تھا لا جواب تھی دلی مگر خیال سے دیکھا تو خواب تھی دلی

پڑی ہیں آنکھیں وہاں جو جگہ تھی نرگس کی

خبر نہیں کہ اسے کھا گئی نظر کس کی

✿✿✿

خالد علوی

غالب کی دلی اور غالب کے دلی والے

یہ بات عام طور پر کہی گئی ہے کہ 1857 کی جنگ آزادی نے شاعر غالب چھین لیا تھا، اس لئے اگر 1857 کے رستاخیز کی بازیافت کرنی ہو تو خطوط غالب سے رجوع کرنا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ دستنبو اور خطوط غالب کی بعض کڑیں ملائی جائیں، غالب کے تمام بیانات پر یقین نہ کیا جائے بلکہ حقائق کی چھلنی میں چھانا جائے تو اس عہد کی مبہم سی تصویر ضرور ی سامنے آجائے گی، غالب نے دستنبو میں جس قدر مصلحت آمیزی روا رکھی ہے خطوط میں اس درجہ نہیں لیکن کسی نہ کسی حد تک ضرور ہے اس لیے اکثر بیانات میں تضادات اور تردید کی صورت پیدا ہوگئی ہے۔

دستنبو میں تو فرنگیوں کو صاحبان علم و دانش، جواں مرد اور گل اندام لکھا ہے۔ بہادر اتنے کہ اگر ان کی رزمیہ حکایات اسفندیار یا رستم سن لیں تو تمام جواں مردی ہوا ہو جائے۔ شیر دل انگریزوں سے لڑنے والے بدبخت ہندوستانی سپاہی سورج ڈھلنے سے قبل ہی واپس آجاتے ہیں۔ نمک حرام باغیوں نے گل اندام انگریزوں کے خون سے زمین کو رنگین کر دیا ہے۔ خوش قسمتی کی بات یہ ہے کہ آزاد اور نیک ذات فرنگیوں کی آرزو پوری ہوگئی۔ بدذات لوگوں کا دور دورہ لکھنو میں بھی ختم ہوگیا۔

شہزادوں کی پھانسی، قید اور گولی مارنے کا ذکر اس طرح ہوتا ہے کہ گویا کانچ کی گولیوں کا ذکر ہے۔ بادشاہ کو کمزور اور ضعیف بتاتے ہوئے مقدمے کی اطلاع بھی دیتے ہیں۔ غالب کے مطابق جھجر، بلب گڑھ اور فرخ نگر کے جاگیرداروں کو علاحدہ علاحدہ مختلف دنوں میں پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ اس طرح ہلاک کیا گیا کہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ خون بہایا گیا۔

غالب، دستنبو میں یہ بھی ہوشیاری دکھاتے ہیں کہ قلعے سے اپنے تعلق کو سرسری اور رسمی ظاہر

کرتے ہیں خود کو ہمیشہ سے انگریزی حکومت کے نان و نمک کا پروردہ اور فرنگی فاتحین عالم کے دسترخوان کا ریزہ چیں بناتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سات آٹھ سال ہوئے کہ بادشاہ دہلی نے مجھ کو بلایا اور مجھ سے فرمائش کی کہ میں تیموریہ خاندان کے بادشاہوں کی تاریخ لکھوں، جس کے عوض 400 روپے سالانہ دیا جائے گا۔ میں نے اس خدمت کو قبول کرلیا اور کام میں مشغول ہوگیا، کچھ عرصے کے بعد بادشاہ کے استاد کا انتقال ہوگیا اور اصلاح شعر کا کام بھی مجھ سے متعلق کر دیا گیا۔

میں بوڑھا اور کمزور تھا، بس گوشہ تنہائی میں بیٹھے رہنے اور آرام کرنے کا عادی ہو چکا تھا اس کے ساتھ بہرے پن کی وجہ سے بارِ خاطر ناظرین ہو جایا کرتا تھا، کوئی بات کر رہا ہے اور میں اس کے ہونٹوں کی جنبش پر نظر جمائے ہوئے ہوں، مجبوراً ہفتے میں ایک دو بار قلعے میں جاتا تھا''(غالب اور انقلاب ستاون مبین الرحمٰن 101)

اس کے باوجود کہ غالب نے بہادر شاہ کی مدح میں پندرہ فارسی قصائد، دو مثنویاں اور چند اردو قصیدے لکھے۔ قدر بلگرامی کو لکھا کہ صبح قلعہ جا کر دوپہر کو آتا ہوں مجروح کے نام لکھا کہ بادشاہ اپنے فرزندوں کے برابر پیار کرتے تھے۔ غالب نے قلعہ اور بادشاہ سے اپنا تعلق اتنا سرسری ظاہر کیا ہے گویا کوئی تعلق ہی نہ تھا۔ حالاں کہ وہ اس وقت سے قلعہ کی سیاست سے وابستہ تھے جب شہزادہ سلیم اور بہادر شاہ ظفر کی شہزادگی کا تنازعہ چل رہا تھا، ساتھ میں یہ بھی ظاہر کرتے ہیں کہ وہ ہمیشہ سے انگریزوں کے نمک خوار اور وفادار ہیں اور ان کا طریقہ رہا ہے کہ جو حاکم ہندوستاں (فرنگی) خصوصاً اس شہر دہلی میں آئیں ان کی مدح میں قصیدہ بھیجا جائے بلکہ وکٹوریہ اور سرجان لارنس کے تہنیتی قصائد کا حوالہ بھی دیتے ہیں (135)

دہلی میں 1857 کی جنگ آزادی میں عموماً مسلمان شریک تھے اس لئے غالب نے یہ بھی التزام رکھا ہے کہ دستنبو میں کسی مسلمان دوست کا ذکر نہ آئے۔ علائی، مجروح وغیرہ، جن سے غالب کے قریبی مراسم تھے دستنبو میں تعارف سے بھی محروم رہے اس کے برعکس مہیش داس، ہیرا سنگھ، شیوجی رام برہمن، ہرگوپال تفتہ اور بال مکند کو مونس و ہمدم اور نیکی پسند قرار دیتے ہیں۔ خان بہادر

(بریلی) شروف الدولہ (لکھنو) کو گمراہ شہرت طلب اور ہما کا شکاری قرار دیتے ہیں۔

دستنبو، چونکہ ایک خاص مقصد سے تحریر کی گئی تھی اس لئے اس پر اعتراض بے معنی ہے غالب کا مقصد فرنگیوں کے لیے اپنی قدیم وفاداری کو مشتہر کرنا اور سکہ گوئی کے الزام سے بری ہونا تھا۔ لیکن لاشعوری طور پر دستنبو سے بھی اس عہد کی دلی کے ایسے حالات ہمارے سامنے آجاتے ہیں کہ کسی اور ماخذ میں دستیاب نہیں ہیں۔

دستنبو کے اس پہلو پر غور کریں تو بہت سی کار آمد اطلاعات ملتی ہیں۔ شہر کی صورت حال یہ تھی کہ کوتوال شہر کی زن ودختر کے علاوہ ساری نازنینان شہر کا زیور سیہ کار کے قبضے میں تھا۔ ڈاک [illegible] نظام درہم برہم ہوگیا تھا۔ دہلی کے اندر پچاس ہزار [illegible] اور پیادوں کی فوج پڑی ہوئی تھی۔ فرنگیوں اور قلعے کے مخبر ریشہ دوانیوں میں مصروف تھے۔ دوکان دار، خریدار اور [illegible] غائب ہوگئے تھے۔ حجام نایاب ہوگئے۔ [illegible] معدوم ہوگئے۔ ہندو اپنی میت کو لے جاکر دریا کے کنارے جلا سکتے ہیں لیکن دو تین مسلمان کو ایک ساتھ کہیں جانے کی اجازت نہیں ہے، مجبوراً غالب کو بھی اپنے بھائی یوسف مرزا کی میت چادر میں لپیٹ کر گھر کے برابر کی مسجد میں دفن کرنا پڑی۔ حسن علی خاں سو روپیہ روز کا پنشن دار تھا وہ بھی نصیر الدین، آغا سلطان کی طرح بغیر دوا کے مر گیا۔ [illegible] نے تکفین وتجہیز کی۔

دستنبو سے ہی پہلی بار معلوم ہوتا ہے کہ حکیم احسن اللہ خاں کے مکانات بحق سرکار ضبط ہوگئے تھے جو بعد میں بحال ہوئے۔ حکیم صاحب کے بارے میں عام اطلاع ہے کہ انہوں نے انگریزوں کی خیر خواہی کی تھی اور مغلیہ شہزادوں کا قتل ان کی نشاندہی کے بعد کیا گیا تھا۔ [illegible] باوجود ان کے شہر سے باہر جانے پر پابندی عائد کر دی گئی تھی۔ ہفتہ میں ایک بار [illegible] ہونے کا حکم تھا۔ ایک فرنگی سپاہی مستقل طور پر ان پر نظر رکھنے کے لئے تعینات تھا۔ غالب احسن اللہ کی انگریزوں کی خیر خواہی کی [illegible] کرتے ہیں اور ان پر قاتلانہ حملے اور بہادر شاہ نے کس طرح ان کے اوپر خود کو گرا [illegible] کی اس کا ذکر کرتے ہیں۔ چوں کہ غالب نے دستنبو

ایک خاص سیاسی نظریہ اپنایا ہے اس لئے ان کے سیاسی بیانات مکمل طور پر قابل قبول نہیں ہیں۔ لیکن دستنبو اور خطوط غالب سے ایک ایسا کولاژ بنایا جا سکتا ہے کہ اس عہد کی دلی، دلی کی زندگی، دلی کی اہم شخصیات، دلی کے مشہور حکیم، دلی کی گلیاں، دلی میں پانی کا انتظام، دلی کا صوبہ پنجاب میں شامل ہونا، دلی کے قانونی حالات، دلی میں چنگی کا نظام، دلی کی اہم مساجد اور امام باڑے، دلی کے مدرسے اور اہم فرنگیوں کے مکمل حالات سامنے آجاتے ہیں۔

دستنبو کی اشاعت کے سلسلے میں مرزا تفتہ اور صاحب مطبع شش و پنج میں مبتلا تھے وجہ یہ تھی کہ 4/ جولائی 1857 کو کلکتے کا ایک مطبع اس لئے ضبط کرلیا گیا تھا کہ اس میں دو باغیانہ مضامین شائع ہوئے تھے۔ غالب براہ راست سزا کا ذکر نہیں کرتے لیکن حکومت کے نظریئے کو ظاہر کر دیتے ہیں۔

دستنبو سے بالواسطہ طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ دلی کے اردگرد کی ریاستیں جھجر پٹودی، بلب گڑھ، فرخ نگر فرنگیوں سے بغاوت پر آمادہ تھیں۔ رام پور کی ریاست انگریزوں کی وفاداری تھی، اس لیے مراد آباد بھی اس کے زیر نگیں بخش دیا گیا تھا۔

دلی کی آبادی کچھ بھی ہو، لیکن مسلمانوں کی آبادی ایک ہزار سے زیادہ نہیں تھی۔ شہر میں وارداتا۔ قید خانہ آبادی کے تناسب سے ہی بنایا گیا تھا لیکن ان میں بے شمار مسلمانوں کو بند کر دیا گیا تھا جن کو پھانسی دی گئی تھی ان کی صحیح تعداد کا علم کسی کو نہ تھا۔

حکیم: اس زمانے میں دلی میں چند اہم حکیم موجود تھے۔ غالب ان سب سے واقف ہیں اور حکیم مومن خاں مومن، حکیم احسن اللہ خاں، حکیم رضی الدین، حکیم کالے، حکیم غلام اللہ خاں، حکیم مرتضیٰ خاں، حکیم محمود خاں، حکیم شریف خاں سے ہماری ملاقات بھی کراتے ہیں۔ خاندانی شریفی کے دو حکیم پٹیالے کے راجہ کے مصاحب ہیں ان کے حوالے سے ان کے سپاہی نے غدر میں غالب کی بھی معاونت کی تھی۔

قانون: دلی کی قانونی صورت حال بھی ہمارے زمانے ہی جیسی تھی یعنی بقول غالب مقدمہ دائر کردو لیکن نتیجہ اس وقت ظاہر ہو جب آپ کے فرزند بوڑھے ہو جائیں (غالب اور انقلاب ستاون

286) الور سے مظفر الدولہ کو گرفتار کیا گیا اور اس گروہ کے ساتھ شہید کر دیا گیا جنہیں بغیر مقدمہ چلائے گوڑ گاؤں میں سزا دی گئی تھی۔ جھجر کے حاکم عبدالرحمٰن، فرخ نگر کے حاکم احمد علی خاں، بہادر گڑھ کے حاکم بہادر جنگ خاں، بلب گڑھ کے حاکم بلب گڑھ کے راجہ ناہر سنگھ کو گرفتار کر کے قلعے میں قید کر دیا گیا۔ مصطفےٰ خاں شیفتہ پر بے بنیاد الزام لگا کر مقدمہ چلایا گیا طویل مقدمے کے بعد رہائی کا حکم ہوا لیکن پنشن ضبط ہوگئی۔ بے گناہ ثابت ہونے پر بھی سزا ملی، جانداد کے بارے میں کچھ فیصلہ نہ ہوا۔ مجبوراً وہ میرٹھ میں کسی دوست کے مکان میں رہنے لگے۔ مولانا فضل خیرآبادی کو ان کے کسی ہم نام کے دھوکے میں سزا ملی۔ فیصلے کے خلاف اپیل ہوئی مگر سزا بدستور رہی اور مولانا کو حبس دوام بہ عبور دریائے شور (انڈومان) بھیجا گیا۔ مفتی صدرالدین بھی حوالات میں رہے طویل مقدمے کے بعد کوئی جرم ثابت نہ ہوا پھر بھی نوکری چھن گئی جائداد ضبط ہوئی۔ احمد حسین میکش کو بغیر وجہ پھانسی دی گئی۔ طالع یار خاں کے دو بیٹے برائے سیر دہلی آئے تھے۔ ہنگامے کی وجہ سے واپس ٹونک نہ جا سکے۔ دونوں کو بغیر گناہ پھانسی دی گئی۔ حکیم رضی الدین خاں کو ایک انگریز فوجی نے بغیر وجہ گولی مار دی۔ احمد حسین خاں اور چھوٹے بھائی بھی اسی دن مارے گئے۔ میر چھوٹم کو بغیر کسی الزام پھانسی دی گئی۔

فرنگی فوج کے ظلم و زیادتی کو غالب سپاہیوں کی ذاتی سنگ دلی کا نتیجہ بتاتے ہیں۔

> ''ہر کوچہ و بازار میں یہ مصیبت یکساں نہیں ہے۔ قتل و لوٹ مار میں بھی سب سپاہیوں کا انداز یکساں نہیں ہے اگر کوئی رحم کرتا ہے یا دوسرا سختی کرتا ہے تو یہ ذاتی رحم اور سنگ دلی کا نتیجہ ہے''(115)

وہ انگریزوں کی زیادتی کو ہندوستانی لوگوں کی بے سبب بغاوت، سفا کی کا ردعمل بتاتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

> ''بے چاری عورتوں اور گہوارے میں کھیلتے ہوئے بچوں کو قتل کیا۔ سب جانتے ہیں کہ آقا سے بے وفائی کرنا گناہ ہے۔ ان انگریزوں کو دیکھو جب دشمنی کے لئے لڑنے کے لئے اٹھے اور گناہ گاروں کو سزا دینے کے لئے لشکر آراستہ کیا۔ ....عورتوں اور بچوں کو ذرا نہیں ستایا۔ گورے راقم الحروف کے گھر گھس آئے لیکن بھلمنسی سے کسی سامان کو ہاتھ

نہیں لگایا۔"

دوسری طرف انگریزوں کی بھل منسی کا یہ حال ہے کہ حافظ محمد بخش سے سوال کیا کہ یہ کیسے ممکن ہے تم محمد بخش بھی اور ممو بھی، جواب دیا کہ اصل نام محمد بخش ہے حافظ ممو مشہور ہوں"۔فرمایا: یہ کچھ بات نہیں حافظ ممو بھی تم ،محمد بخش بھی تم۔ہم مکان کس کو دیں؟ (بنام یوسف مرزا۔جون 1859)

فرنگیوں نے ہندوستانی عوام کے لیے کچھ مخصوص قوانین بھی وضع کیے تھے۔ڈاک کا پرانا نظام یک قلم موقوف کر دیا گیا تھا۔ نئے ڈاک نظام کے مطابق خط کو بیرنگ بھیجا جا سکتا تھا لیکن خط میں دوسرا خط داخل نہیں کیا جا سکتا تھا۔غالب کے بقول اس جرم کی سزا پچاس روپیہ جرمانہ یا قید ہے۔ منشی غلام بسم اللہ کو لکھتے ہیں۔

> "سنیے حضرت، خط میں تداخل برا ہے۔اگر یہاں کی ڈاک میں کبھی خط کھل گیا تو مجھ سے پچاس روپیہ لئے جائیں گے۔یا قید کا حکم ہوگا۔آئندہ آپ خط جداگانہ بھیجا کیجیے۔اس باب میں تاکید جانئے۔کوئی حیلہ جواز آپ کی طرف سے مسموع نہ ہوگا"(خطوط غالب۔خلیق انجم 805)

چنگی محصول: فرنگیوں کی آمد سے قبل ہندوستان میں چنگی octroi کا کائی تصور نہ تھا غالب کے خطوط سے ہی اس نئے ٹیکس کی پہلی بار اطلاع ملتی ہے جسے غالب نہ جانے کیوں یون ٹوٹی کہتے ہیں:

> "یون ٹوٹی کے باب میں کونسل ہوئی۔7/نومبر 1859 کو جاری ہوگئی۔غلے اور اپلے کے علاوہ کوئی جنس ایسی نہیں ہے کہ جس پر محصول نہ ہو" (بنام حسین مرزا9/نومبر 1859)

میر مہدی مجروح کے نام8/نومبر 1859 کو اطلاع دیتے ہیں:

> "یون ٹوٹی" کوئی چیز ہے وہ جاری ہوگئی ہے سوائے اناج اور اپلے کے کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس پہ محصول نہ ہو۔

یہ یون غالباً ٹاؤن ڈیوٹی کی مخرب شکل ہے۔

معاوضہ: یہی نہیں فرنگیوں نے ایک محکمہ معاوضہ بھی قائم کیا جس کی بنیاد نہایت عدل و انصاف پر رکھی تھی یعنی رعایا کا مال اگر کالوں نے لوٹا ہے تو مطالبے کا دس فیصد معاوضہ دیا جائے گا۔جو گوروں

کی فوج نے غارت گری کی ہے اس کا کوئی معاوضہ نہ ہوگا۔ اس منصفانہ معاوضے کی خبر بھی غالب کے خط بنام حسین مرزا بتاریخ 31/دسمبر 1857 سے ملتی ہے:

''ایک محکمہ میں لاہور معاوضہ نقصان رعایا کے واسطے تجویز ہوا ہے اور یہ حکم ہے کہ جو رعیت کا مال کالوں نے لوٹا ہے، البتہ اس کا معاوضہ بہ حساب وہ ایک سرکار سے ہوگا۔ یعنی ہزار روپیہ مانگنے والے سو روپیہ ملیں گے اور جو گوروں کے وقت کی غارت گری ہے وہ ہدر اور بحل (مباح اور معاف) ہے اس کا معاوضہ نہ ہوگا۔'' (بنام حسین مرزا 31/دسمبر 1859)

ٹکٹ: دلی پر فرنگیوں کے تسلط کے بعد مسلم آبادی کے داخلے کے لیے ایک ٹکٹ جاری ہوا تھا۔ مہدی مجروح کے نام ایک خط سے ٹکٹ پر مرقوم عبارت معلوم ہوتی ہے:

''ٹکٹ آبادی درون شہر دہلی بشرط ادخال جرمانہ'' (مجروح فرور 1859)

جو مسلمان دلی شہر میں اقامت چاہے وہ کچھ روپیہ نذر دے کر ٹکٹ حاصل کرسکتا تھا۔ لیکن نذرانے کی رقم حاکم طے کرتا ہے۔ غلام نجف خاں کے نام ایک خط میں غالب اطلاع دیتے ہیں کہ بے ٹکٹ باہر نہیں نکل سکتے۔ مجروح کے نام 2/فروری 1859 کے خط سے پتہ چلتا ہے کہ لاہوری دروازے کا تھانے دار مونڈھا بچھا کر سڑک پر بیٹھا ہے جو باہر سے گورے کی آنکھ بچا کر آتا ہے اس کو پکڑ کر حوالات میں بھیج دیتا ہے، حاکم کے یہاں سے پانچ پانچ بید لگتے ہیں۔ دو روپیہ جرمانہ لیا جاتا ہے۔ آٹھ دن قید رہتا ہے۔ ٹکٹ کی نشر و اشاعت اجرٹن صاحب کی ذہنی اختراع تھی۔ یوسف مرزا کے نام 18/اگست 1859 کے مراسلے سے پتہ چلتا ہے کہ آمد و رفت کا ٹکٹ موقوف ہوگیا۔ صرف ہتھیار بند اشخاص اور گداگروں کو شہر میں داخلے کی اجازت نہیں لیکن رات کے قیام کے لیے ٹکٹ ضروری تھا۔

جامع مسجد: 1857 کی جنگ آزادی کے بعد جامع مسجد پر انگریزوں نے قبضہ کرلیا تھا۔ کیوں کہ ہنگامے کے دوران جامع مسجد سے نمازیوں کے ایک گروہ نے قبضہ کرلیا تھا۔ لارڈ کارنوالس کے رائے تھی کہ مسجد کو مسمار کردیا جائے۔ لیکن لارڈ ہکڈ انلڈ نے اس فعل سے حکومت کو باز رکھا۔ ایک

مشورہ یہ بھی تھا کہ شاہجہانی مسجد کو گرجے میں تبدیل کر دیا جائے، کئی سال کی کوششوں کے بعد مسجد واگزاشت ہوگئی اور مسجد کے چاروں طرف رونق ہوگئی۔ انڈا، مرغی اور کبوتر بکنے لگے۔ سرکار نے دس آدمیوں کی ایک کمیٹی کو اہتمام سونپا۔ غالب نے دس آدمیوں کی اس کمیٹی کو عشرۂ مبشرہ قرار دیا۔ مجروح کے نام 16 ردسمبر 1826 کے خط میں ذکر کیا۔

پانی: غالب کو پانی کی اہمیت کا بخوبی اندازہ تھا۔ کنوؤں کے کھاری ہونے یا لال ڈگی اور حوض قاضی کے کنوؤں کے بند ہونے پر ان کی تشویش لازمی تھی لیکن اس پر آشوب دور میں اہالیان دلی پینے کا پانی حاصل کرنے کے لیے کیا تدابیر کرتے ہیں غالب کے خطوط میں اس کی بڑی دلچسپ جھلک نظر آتی ہے۔

''قاری کا کنواں بند ہوگیا۔ لال ڈگی کے کنویں یک قلم کھاری ہوگئے، خیر کھاری ہی پانی پیتے۔ گرم پانی نکلتا ہے۔'' (بنام مجروح 1861)

اس وقت پانی کی کتنی کمی تھی اس کا اندازہ دستنبو کی اس عبارت سے ہوتا ہے۔

''پانی اگرچہ بے حد احتیاط سے پیا گیا لیکن آخر کار کوزے یا ایک گھڑے میں ایک قطرہ نہیں رہا۔ دو شبانہ سب بھوکے پیاسے رہے۔'' (غالب اور... 118)

''بہشتی اور مشک کا ملنا ناممکن تھا۔ اس لئے ہر گھر سے دو مرد اور میرے ملازمین میں سے دو شخص گئے۔ میٹھا پانی دور تھا اور اتنی دور نہیں جا سکتے تھے۔ مجبوراً نیم شور پانی مٹکوں اور گھڑوں میں بھر لائے اس طرح نمکین پانی سے وہ آگ بجھی جس کا دوسرا نام پیاس ہے(''... 119)

لیکن غالب نے قدرتی پانی جمع کرنے کی ترکیب ڈھونڈ ہی نکالی۔

''ایک دن اچانک بادل آیا، پانی برسا۔ ہم نے صحن میں چادر باندھ لی اور ایک مٹکا اس کے نیچے رکھ دیا اور پانی حاصل کیا۔ کہا جاتا ہے کہ بادل دریا سے پانی لیتا ہے اور زمین پر برساتا ہے اس بار یہ ہما صفت بادل پانی چشمہ حیواں سے لایا۔ گویا سکندر نے جو چیز اپنی بادشاہت کے دور میں ڈھونڈی تھی مجھ پریشاں حال نے وہ دولت اس تباہی و بربادی کے عالم میں پالی۔''(...119)

دلی کی گلیاں اور کوچے: دلی پر فرنگیوں کے تسلط کے بعد شہر کی عمارتوں، شاہراہوں، مسجدوں اور

بازاروں کو بیدردی سے مسمار کیا گیا۔ اپنی روایتی حکمت عملی سے کام لے کر فرنگیوں مغل بادشاہوں پر بہت سے الزامات لگائے جن کے مطابق مغلوں کے صناعوں کے ساتھ بدسلوکی کی۔ حد یہ ہے کہ تاج محل کے معمار کے ہاتھ کاٹ دیئے تھے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ انگریزوں نے لال قلعہ کے اردگرد ہنر مندوں کی متعدد بستیوں کو تاراج کر دیا تھا۔ آثارالصنادید واقعات دارالحکومت، سیر المنازل میں بھی ان بستیوں، گلیوں اور سڑکوں کا ذکر بہت کم ہے جو معدوم ہوگئی ہیں۔ لیکن خطوط غالب سے نہ صرف اس عہد کی دلی کا نقشہ تیار کیا جاسکتا ہے بلکہ دلی کے نواح کی تمام ریاستیں بھرت پور، جھجر، فرخ نگر، گوڑ گانوہ، فرید آباد، پٹودی، بلب گڑھ، میوات کا اندازہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ دلی کے جن علاقوں پر غالب نے توجہ دی ہے ان میں کچھ نام یہ ہیں۔

لاہوری دروازہ، اجمیری دروازہ، بلی ماروں کا محلہ، چیلوں کا کوچہ، دریبہ، چاوڑی بازار، بلاقی بیگم کا کوچہ، خاں دوراں کی حویلی، چاندنی چوک، مہرولی، جامع مسجد، گلی قاسم جان، پھاٹک میر خیراتی، پھاٹک فتح اللہ خاں، کمرہ ضیاءاللہ خاں، لال کنواں، لال ڈگی، اردو بازار، خانم بازار، خان چند کا کوچہ، شاہ بولا کا بڑ، مدرسہ دارالبقا، فیل خانہ، جاں نثار خاں کا چھتہ، نثار خاں کا چھتہ، کوچہ خان چند، فلک پیرا، کشمیری کٹرہ، راج گھاٹ، کشمیری دروازہ، کلکتہ دروازہ، کابلی دروازہ، پنجابی کٹرہ، دھوبی واڑہ، رام جی گنج، سعادت خاں کا کٹرہ، جرنیل کی بی بی کی حویلی، صاحب رام جی کا باغ، صاحب کٹرہ سعادت خاں، کوچہ استاد حامد، نہر سعادت خاں، مینا بازار، کٹرہ رود گراں، شاہدرہ، خاص بازار، حویلی میر خیراتی، حویلی کروڑا والی، حکمیوں کی گلی، کٹرہ شعبان بیگ، حکیم محمد حسن خاں کی حویلی، چتلی قبر، چورس کی کوٹھی، پھاٹک حبش خاں، بیگم کا باغ، باغیچہ مرزا گوہر، بساون کی گلی، املی کا محلہ، آزاد پور کا باغ۔

متعدد خطوط میں کنوؤں کو بند کرنے کا ذکر، سڑکیں چوڑی کرتے [illegible]ت عمارات کو مسمار کرنے کا حوالہ اور کئی معدوم ہوتی ہوئی نشانیوں پر غالب کو خصوصی طور سے اذیت [illegible] مبتلا کیا ہے۔

غالب کے دلی والے: غالب نے ایک خط میں لکھا ہے کہ ستر سال کی عمر میں ستر ہزار لوگوں کو قریب

سے دیکھنے کا موقع ملا۔ ہزاروں سے قربت رہی، غالب کو بلا شبہ یہ اعزاز حاصل ہے کہ ان کے دوستوں اور شاگردوں کی تعداد ہزاروں میں ہے۔ غالب کے ان عزیزوں کی تعداد بھی سو سے زیادہ ہے جن کے نام مکتوبات میں موجود ہیں۔ کچھ تو غالب کی شخصیت کا بانکپن کچھ ان کی نیم مذہبی زندگی کی وجہ سے غیر ملکی یورپین لوگوں کی تعداد بھی کافی جو کسی نہ کسی طور غالب سے متعلق تھے۔ غالب کے کئی شاگرد فرنگی بھی تھے۔ کچھ مکتوبات میں غالب نے بعض انگریزوں کا ذکر کیا ہے۔

سر ولیم ہنری ریٹی گن: تفتہ کے نام ایک خط میں غالب نے لکھا:

> ''ڈکرو در صاحب ڈپٹی کلکٹر مہینے کی رخصت لے کر پہاڑ پر گئے۔ ان کی جگہ ریٹی گن صاحب مقرر ہوئے ان سے ناچار ملنا پڑا۔ وہ تذکرہ شعرائے ہند کا انگریزی میں لکھتے ہیں۔ مجھ سے بھی انہوں نے مدد چاہی۔'' (خطوط: خلیق انجم 346)

دوسرے خطوط میں بھی ریٹی گن کا حوالہ ملتا ہے۔

> ''پہلا خط تم کو ان کے بھائی مولوی انوارالحق نے بہ موجب حکم ریٹی گن صاحب کے لکھا''
> (خطوط: 348)

> ''مرزا تفتہ کیا فرماتے ہیں؟ کیسے ریٹی گن صاحب، کہاں ریٹی گن صاحب۔ انیس جنوری سنہ حال کو وہ پنجاب کو گئے۔ ملتان یا پشاور کس کے حاکم ہوئے ہیں۔'' (خطوط۔ 349)

ریٹی گن 4/ستمبر 1842 کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر رہے۔ اسی دوران انھوں نے وکالت پاس کی اور لاہور میں وکالت شروع کی۔ پنجاب ہائی کورٹ کے جج اور پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہے۔ 1900 تک ہندوستان میں رہے۔ 4/جولائی 1904 کو موٹر حادثے میں جان بحق ہوئے۔ ان کے انگریزی تذکرے کے لیے غالب نے سولہ شعرا کا حال لکھا تھا۔

سی بی سانڈرس C.B.Saunders: سانڈرس کا ذکر غالب نے میر مہدی مجروح کے نام ایک خط میں کیا ہے۔

> ''صاحب کمشنر بہادر دہلی یعنی جناب سانڈرس صاحب بہادر نے مجھے بلایا پنجشنبہ 24 فروری کو ہی گیا صاحب شکار کو سوار ہو گئے تھے میں الٹا پھر آیا جمعہ 25 فروری کو گیا ملاقات ہوئی۔''

سانڈرس امرتسر میں ڈپٹی کمشنر تھے۔ دہلی میں عارضی طور پر کمشنر رہے بہادر شاہ ظفر کے

مقدمے میں یہ سرکاری وکیل تھے۔

سر چارلس ایڈورڈ بیرونیٹ ٹریولین Sir Charles Sdward Braoned Travelyn

علائی کے نام ایک خط میں ٹریولین کا ذکر ملتا ہے۔

''جناب ٹریولین صاحب بھائی کے دوست دلی، دلی آئے لارڈ صاحب کہلاتے ہیں۔ سنتا ہوں کہ کل آلہ آباد جاتے ہیں۔'' (خطوط...509)

ٹریولین ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے پہلے اسسٹنٹ کمشنر پھر محکمہ خارجہ میں انڈر سکریٹری مقرر ہوئے۔ ملکہ کی حکومت ہو جانے کے بعد مدراس کے گورنر بنے۔ یہ لارڈ میکالے کی سگی بہن کے شوہر تھے۔ میکالے کی تعلیمی پالیسی کے سلسلے میں یہ بھی بہت پیش پیش تھے۔

جان جیکب John Jacob: جان جیکب سے غالب کا خصوصی تعلق تھا۔ پاکستان کا مشہور شہر جیکب آباد ان کے نام پر آباد کیا گیا ہے۔ یہ 1844 میں غالب کے مہمان ہو کر دہلی آئے تھے۔ غالب نے نواب ضیاء الدین کے مہمان خانے میں ٹھہرایا۔ جان جیکب کے نام غالب کے چھ فارسی خطوط ہیں۔ مرزا ہرگوپال تفتہ، نبی بخش حقیر اور مرزا حاتم علی بیگ مہر کے نام کئی خطوط میں جیکب کا ذکر ہے۔ جیکب نے دیوان حافظ بھی مرتب کیا تھا جس کی تقریظ غالب نے لکھی تھی۔

الگزنڈر اسکنر سکندر Alexender Skinner: سکندر اردو اور فارسی میں شعر کہتے تھے غالب نے علاء الدین احمد خاں علائی کے نام ایک خط میں ان کا ذکر کیا ہے۔

> ''ہاں مرزا علائی اگر کرنیل الگزنڈر اسکنر سے ملاقات ہو تو میرا سلام کہنا''۔ (خطوط غالب۔ خلیق انجم 427)

الگزنڈر کی قبر کشمیری گیٹ کے چرچ میں ہے اس چرچ کو الگزنڈر کے دادا ہرکولیس نے بنوایا تھا سکندر کی بیوی کی قبر پر یہ فارسی قطعہ درج ہے۔

که بانوے اسکنر الک زنڈر آں که بگذیده طریق عیسوی بهر نجات
سردار یبو خطاب ایلیس اینے صد حیف که از قضائے حق بافت وفات

ذوبست و سوم ز جنوری یکشنبہ ہجدہ صد وہشتادویکم از سنوات

یہ قطعہ ضیاء الدین خاں نیر درخشاں کا کہا ہوا ہے۔ سکندر کی قبر پر خود اس کے چار اشعار درج ہیں۔

جس نے در کی ترے گدائی کی اس کو خواہش نہ بادشاہی کی
جس نے سینہ کیا نہ صاف اپنا اس نے کیا خاک پارسائی کی
کارنیکی سے درگزر مت کر اس میں جو ہو رضا الٰہی کی
اس سے بہتر ہے اسکنر تیرا نکلے دم یاد میں الٰہی کی

بلیک صاحب: غالب نے مجروح کے نام نومبر 1859 کے خط میں بلیک کی موت کا ذکر کیا ہے:

''بلیک صاحب کے جے پور میں ٹکڑے اڑ گئے گورنر مدعی نہ ہوئے قصاص نہ لیا۔''
(خطوط..498)

جے پور کے راجہ ہردیال سنگھ کے انتقال کے بعد سیاسی ہنگاموں میں بلیک کا قتل ہوا۔

الگزنڈر ہیڈرلی آزاد: الگزنڈر ہیڈرلی اردو فارسی کا صاحب دیوان شاعر تھا اس کا اردو دیوان اس کی موت کے بعد اس کے بھائی نے شائع کیا۔ غالب نے مجروح کے نام کئی خطوط میں ہیڈرلی کا ذکر کیا ہے:

''الور میں بھی وبا ہے الگزنڈر ہیڈرلی مشتہر بہ الک صاحب مرگیا واقعی بے تکلف وہ میرا عزیز اور نثری خواہ اور راج میں اور مجھ میں متوسط تھا۔'' (خطوط... 530)

''الگزنڈر ہیڈرلی کا کوئی خط نہیں آیا۔ ظاہرا ان کی مصاحبت نہیں۔'' (خطوط.. 524)

''اس خیال میں تھا کہ الور کا کچھ حال معلوم کرلوں اور کپتان ہیڈرلی الگزنڈر کا خط آئے۔'' (خطوط528)

الگزنڈر ہیڈرلی آزاد، الک صاحب کے نام سے مشہور تھے۔ رام بابو سکسینہ نے ان کا بہت سا کلام بطور نمونہ دیا ہے۔ آزاد کی والدہ ایک مسلم خاتون تھی۔ الگزنڈر آزاد نے حمد اور نعت کے علاوہ اپنے بھائی نظام الدین، نواب علی احمد خاں، ٹامس ہیڈرلی، مہاراجہ سندھیا، راجہ شیودان سنگھ آف الور، عبدالرحمٰن خاں والی جھجر کی مدح میں قصیدے بھی لکھے۔

✿✿✿

ڈاکٹر حنا آفرین

خطوط غالب کی روشنی میں دلّی کے تاریخی حالات

مرزا اسداللہ غالب کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں اور اہم بات یہ ہے کہ ہر پہلو نہ صرف عہد ساز ہے بلکہ حیرت انگیز ہے۔ ان کی شاعری کی معنی آفرینی اور تہہ داری آج بھی اہل نظر کے لیے مرکز کشش ہے۔ وہ شاعری کے علاوہ اردو نثر میں بھی ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ نثر میں وہ اپنے طرز کے موجد بھی ہیں اور خاتم بھی۔ ان کی نثری تحریروں میں خطوط کا سرمایہ گراں قدر ہے۔ ان کے خطوط اردو ادب کے بیش قیمت سرمایہ ہیں، جو نہ صرف مکتوب نگار کی شخصیت کی نمائندگی کرتے ہیں بلکہ ان کے ذریعہ اس عہد کے سیاسی، سماجی، تاریخی اور معاشی حالات بھی معلوم ہوتے ہیں۔ غالب کی خوبی یہ ہے کہ مکتوب نگاری کو انھوں نے محض خیر و عافیت دریافت کرنے تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ اس میں علمی و ادبی مباحث بھی پیش کیے۔ حالی، غالب کے خطوط کی اہمیت اور انفرادیت کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

> ''مرزا کی اردو خط وکتابت کا طریقہ فی الواقع سب سے نرالا ہے۔ نہ مرزا سے پہلے کسی نے خط وکتابت میں یہ رنگ اختیار کیا اور نہ ہی ان کے بعد کسی سے ان کی پوری تقلید ہوسکی۔ انھوں نے القاب وآداب کا پرانا اور فرسودہ طریقہ اور بہت سی باتیں جن کو مترسلین نے لوازم نامہ نگاری میں سے قرار دے رکھا تھا۔ مگر درحقیقت فضول اور دوراز کار تھیں، سب اڑادیں۔'' (بحوالہ یادگار غالب از حالی ترتیب مالک رام ص 199)

غرض غالب نے القاب وآداب کے پرتکلف اور فرسودہ طریقے کو ترک کیا اور خطوط میں عام بول چال کی زبان استعمال کرکے تحریر کو زندگی کے قریب کردیا۔ ساتھ ہی مراسلہ کو مکالمہ بنایا، ان سب خصوصیات کی بنا پر ہی ان کی نثر میں بے ساختگی اور بے تکلفی پائی جاتی ہے۔ غالب کے خطوط

کئی حیثیتوں سے اپنی شناخت قائم کرتے ہیں۔ مثلاً (1) علمی وادبی (2) سیاسی وسماجی (3) تاریخی غالب کے خطوط میں علمی وادبی مباحث بکثرت ملتے ہیں۔ اس تعلق سے کہیں انھوں نے لفظ کی صحت پر بحث کی ہے تو کہیں لفظ کے معنی بیان کیے ہیں۔ بعض جگہ الفاظ کی تذکیروتانیث سے متعلق بھی بحث کی ہے۔ کچھ خطوط میں عروض کے مسائل زیر بحث لائے ہیں۔ ان کے علاوہ علمِ بلاغت سے متعلق اپنے شاگردوں کے شبہات بھی دور کیے ہیں۔ غالب نے دوستوں اور شاگردوں کی اصلاحِ شعر کے ذریعے شاعری کے بعض اہم نکات اور اصولوں کی بھی وضاحت کی ہے۔ اس طرح خطوط غالب نہ صرف سیاسی وسماجی لحاظ سے اہم ہیں بلکہ علمی وادبی اعتبار سے بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ جہاں تک خطوط غالب کی سماجی اہمیت کا سوال ہے۔ انھوں نے اپنے خطوط میں پنشن کی تفصیلات کے ساتھ ساتھ ہندوؤں اور مسلمانوں کے آباد ہونے کے متعلق انگریزوں کے حکم کا جو ذکر کیا ہے اس سے اگر اس وقت کے سیاسی حالات سے آگہی حاصل ہوتی ہے تو اطراف وجوانب کی تصویر کشی سے اس عہد کے سماجی حالات پر روشنی پڑتی ہے۔ چونکہ ہمارے مطالعے کا موضوع خطوط غالب کی روشنی میں دلی کے تاریخی حالات تک محدود ہے اس لیے علمی و ادبی اور سماجی وسیاسی اہمیت سے قطع نظر ایک نگاہ تاریخی حقائق پر ڈالتے ہیں۔

انگریزوں کا ہندوستان پر قابض ہونا اور پھر ہندوستانیوں کا اپنی آزادی کے لیے جدوجہد کرنا ہندوستانی تاریخ کا اہم ترین باب ہے جس کا ذکر کہیں تفصیل اور کہیں اختصار کے ساتھ غالب کے خطوط میں مل جاتا ہے۔ 1857 کی جنگ آزادی کو ناکام کرنے کے لیے انگریزوں نے ظلم وجبر کا سہارا لیا اس میں کافی تعداد میں لوگوں کو سزائیں دی گئیں۔ کچھ کو کالا پانی بھیجا گیا اور کچھ کو موت کے گھاٹ اتارا گیا جس کے سبب پورے ملک میں خوف ودہشت کا ماحول پیدا ہو جانا فطری تھا۔ غالب اس عہد کے چشم دید گواہ تھے۔ ایسے دور میں جب انگریزوں کے ظلم وستم کی کوئی حد نہیں تھی۔ ان کے خلاف زیادہ کچھ لکھنا خود کو مصیبت میں ڈالنا تھا لیکن غالب جیسے حساس انسان کا خاموش رہنا بھی آسان نہ تھا۔ لہٰذا 5ر دسمبر 1857 کے خط میں وہ اپنے شاگرد اور دوست مرزا ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں:

"مبالغہ نہ جاننا۔ امیر غریب سب نکل گئے۔ جو رہ گئے نکالے گئے۔ جاگیردار پنشن دار،

دولت مند، اہل حرفہ کوئی بھی نہیں ہے۔ مفصل حال لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ ملازمانِ قلعہ پر شدت ہے۔ باز پرس اور دارو گیر میں مبتلا ہیں۔'' (غالب کے خطوط جلد اول مرتبہ خلیق انجم ص 267)

ظاہر ہے غالب کے دل و دماغ پر بھی باز پرس اور دارو گیر کا خوف حاوی تھا اس لیے انھوں مفصل حالات لکھنے سے گریز کیا لیکن اشارے کنایے میں وہ اتنا کچھ کہہ جاتے ہیں کہ اس عہد کے حالات کو سمجھنے میں دشواری نہیں ہوتی۔ 26 / دسمبر 1857 کے خط میں غلام نجف خاں کو غالب لکھتے ہیں:

''انصاف کرو (خط) لکھوں تو کیا لکھوں؟ کچھ لکھ سکتا ہوں؟ کچھ قابل لکھنے کے ہے؟...
بس اتنا ہے کہ اب تک ہم تم جیتے ہیں۔ زیادہ اس سے نہ تم لکھو گے نہ میں لکھوں گا۔'' (غالب کے خطوط جلد دوم مرتبہ خلیق انجم ص 624)

یہاں واضح طور پر کچھ نہیں کہا گیا ہے لیکن یہ کہہ کر کہ 'لکھوں تو کیا لکھوں؟ کچھ لکھ سکتا ہوں کچھ قابل لکھنے کے ہے؟ جہاں یہ بتا دیا کہ کہنے والا بھی مجبور ہے وہیں یہ بھی ظاہر کر دیا کہ اس اجڑے دیار میں ایسا کچھ نہیں بچا جس کے لکھنے کی طرف طبیعت راغب ہو سکے۔ 5 / دسمبر 1857 میں مرزا تفتہ کے خط میں غالب لکھتے ہیں:

''اپنے مکان میں بیٹھا ہوں، دروازے سے باہر نہیں نکل سکتا۔ سوار ہونا اور کہیں جانا تو بہت بڑی بات ہے۔ رہا یہ کہ کوئی میرے پاس آوے، شہر میں کون ہے جو آوے؟ گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں۔ (غالب کے خطوط جلد اول مرتبہ خلیق انجم 268)

اس خط کو پڑھ کر اس وقت کی دلی کی صورت حال نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔ جب انگریزوں نے جوشِ انتقام میں بے رحمی اور سفاکی کی انتہا کر دی تھی۔ ظاہر ہے ان حالات کا تفصیلی ذکر خط میں ممکن نہیں تھا اور طبیعت اس پر راضی نہیں تھی کہ اب کچھ دیکھتے ہوئے بھی خاموشی اختیار کر لی جائے۔ لہٰذا غالب نے اپنے روز نامچے 'دستنبو' میں دلی کے حالات قدرے تفصیل سے قلم بند کیے۔ اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ وقت اور مصلحت کے تحت غالب جن باتوں کو خطوط میں کھل کر نہیں بیان کر سکے، انھیں روزنامچے کی شکل دی جس سے غالب کے خطوط کی تاریخی اہمیت کی تصدیق

ہوتی ہے۔ غالب نے انقلابیوں اور انگریزوں کی جنگ کی تصویر 'دستنبو' میں اس طرح پیش کی ہے:

''توپوں اور بندوقوں کے دھوئیں سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے نیلے آسمان پر کالی گھٹا چھائی ہوئی ہے اور اس سے اولے برس رہے ہیں۔ رات دن دونوں طرف سے گولہ باری ہوتی ہے جیسے اوپر سے پتھر برس رہے ہوں.... اگر اسفند یار اس میدان جنگ میں ہوتا تو روئین تنی (لوہے کے جسم) کے باوصف اس کی جواں مردی ہوا ہو جاتی۔ اگر رستم اس داستان کو سن لیتا تو بے پناہ طاقت کے باوجود جی چھوڑ دیتا۔'' (دستنبو۔ مترجم شریف حسین قاسمی ص 87)

دستنبو میں غالب مزید دلی کے حالات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس شہر میں قید خانہ شہر سے باہر ہے اور حوالات اندرونِ شہر۔ ان دونوں میں بے شمار لوگوں کو بھر دیا گیا ہے (ان محدود مقامات میں کثرتِ تعداد دیکھ کر) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آدمی میں آدمی سمایا جا رہا ہے۔ ان دونوں قید خانوں کے جن قیدیوں کو مختلف دنوں میں پھانسی دے دی گئی ہے ان کی تعداد فرشتۂ موت ہی جانتا ہے۔ (دستنبو۔ مترجم شریف حسین قاسمی ص 118)

انگریزوں کے ظلم و استبداد کی ایسی دل دہلانے والی داستان غالب کے خطوط میں اختصار اور روزنامچے میں تفصیل سے ملتی ہے۔ انگریزوں نے ہندوستانیوں کے حوصلوں کو پست کرنے کے لیے انقلابِ ستاون کے بعد بھی قتل عام کیا تاکہ لوگوں کے دلوں میں انگریزوں کے خلاف آواز بلند کرنے کا حوصلہ نہ رہ سکے۔ مگر اس کے باوجود ہندوستان کو آزاد کرانے کے لیے انقلابی سرگرم رہے اور خون کی ندیاں بہتی رہیں۔ غالب 1858 میں میر سرافراز حسین کو لکھتے ہیں:

''وہی بالا خانہ ہے اور وہی میں ہوں۔ سیڑھیوں پر نظر کہ وہ میر مہدی آئے، وہ میر سرفراز حسین آئے، وہ یوسف مرزا آئے، وہ میرن آئے، وہ یوسف علی خاں آئے، مرے ہوؤں کا نام نہیں لیتا، بچھڑے ہوؤں میں سے کچھ گنے ہیں۔ اللہ اللہ، اللہ! ہزاروں کا میں ماتم دار ہوں، میں مروں گا تو مجھ کو کون روئے گا؟... کیا مجمع برہم ہوا! مجھ کو کیسا غم ہوا ہے۔' (غالب کے خطوط جلد دوم مرتبہ خلیق انجم ص 762)

شیونرائن آرام کو 19 /اپریل 1859 میں لکھتے ہیں:

''ہندوستان کا قلمرو بے چراغ ہوگیا۔ لاکھوں مرگئے، جو زندہ ہیں ان میں سینکڑوں گرفتارِ بند بلا ہیں۔۔۔۔جو زندہ ہیں، اس میں مقدور نہیں۔'' (غالب کے خطوط جلد سوم مرتبہ خلیق انجم ص 1071)

ان اقتباسات سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ وہ ایسا پر آشوب دور تھا جس نے معاشرے کے تقریباً تمام طبقے اور شعبے کے افراد کو ڈس لیا تھا۔ کیا اہلِ ثروت اور کیا اہلِ حرفہ سب زندہ ہو کر بھی زندگی سے محروم تھے۔ بہتوں کو سزائیں دی گئیں اور بہتوں کو موت دی گئی۔ دلی وہ دلی نہ رہی جس کی شان وشوکت اور تہذیب مشہور تھی۔ نواب علا الدین خاں علائی کے خط کے جواب میں غالب ان کو دلی کے حالات سے واقف کراتے ہوئے 16/فروری 1862 کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

''اے میری جان! یہ دلی نہیں ہے جس میں تم پیدا ہوئے ہو وہ دلی نہیں ہے جس میں تم نے علم تحصیل کیا ہے۔ وہ دلی نہیں جس میں تم شعبان بیگ کی حویلی میں مجھ سے پڑھنے آتے تھے، وہ دلی نہیں ہے جس میں سات برس کی عمر سے آتا جاتا ہوں، وہ دلی نہیں ہے جس میں اکیاون برس سے مقیم ہوں، ایک کیمپ ہے۔۔۔۔شہر کی عمارتیں خاک میں مل گئیں۔ ہنرمند آدمی یہاں کیوں پایا جائے۔'' (غالب کے خطوط جلد سوا اول مرتبہ خلیق انجم ص 383)

گویا غالب نے بچپن سے جس جگمگاتی ہوئی دلی کو دیکھا تھا یک لخت تباہ و برباد ہوگئی۔ اس اقتباس سے جہاں یہ اندازہ ہوتا ہے وہیں غالب کے سوانحی حقائق پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ 1857 کی جنگ آزادی میں انگریزوں سے ہندوستانیوں کے ناکام ہونے کی کئی وجوہات تھیں۔ اول تو یہ کہ ہندوستانیوں کے پاس انگریزوں کی بہ نسبت بہت کم آلات تھے اور تھے بھی تو وہ انگریزوں کی مانند جدید اور اعلیٰ قسم کے نہیں تھے۔ دوسرے یہ کہ اس ملک کے کچھ لوگ اپنے مفاد کی خاطر انگریزوں سے مل گئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جوش وخروش کے باوجود ہندوستانی ناکام ہوئے

جس کا ذکر غالب نے 1860 میں انوار الدولہ شفق کو لکھے خط میں اس طرح کیا ہے:

"(کئی) لشکروں کا حملہ پے در پے اس شہر (دہلی) پر ہوا۔ پہلا باغیوں کا لشکر۔ اس میں اہل شہر کا اعتبار لٹا۔ دوسرا لشکر خاکیوں کا، اس میں جان و ناموس، مکان و مکین و آسمان و زمین و آثارِ ہستی سراسر لٹ گئے۔" (غالب کے خطوط جلد سوم مرتبہ خلیق انجم ص 989)

1858 کی ابتدا میں دلی کی صورتحال یہ تھی کہ صرف ہندوؤں کو شہر میں آباد ہونے کی اجازت دی گئی تھی مگر بعد میں انگریزی حکام نے کچھ شرطوں کے ساتھ مسلمانوں کی آبادی کا حکم دے دیا۔ شہر میں آباد ہونے کے لیے انگریزوں نے ایک اجازت نامہ تحریر کروایا اور اس کی اجرت ہندوستانیوں سے وصول کی۔ ان تاریخی حقائق کا ذکر غالب کے خطوط میں ملتا ہے۔ 2/فروری 1859 کو میر مہدی مجروح کے نام غالب ایک خط میں لکھتے ہیں:

(آبادی کے) پانچ ہزار ٹکٹ چھاپے گئے جو مسلمان شہر میں اقامت چاہے، بہ قدر مقدور نذرانہ دے، اس کا اندازہ قرار دینا حاکم کی رائے پر ہے۔ روپیہ دے اور ٹکٹ لے۔ گھر برباد ہو جائے، آپ شہر میں آباد ہو جائے۔ آج تک یہ صورت ہے دیکھیے شہر کے بسنے کی کون مہورت ہے؟ جو رہتے ہیں، وہ بھی اخراج کیے جاتے ہیں یا جو باہر پڑے ہوئے ہیں، وہ شہر میں آتے ہیں؟ الملکُ للہ والحکم للہ۔" (غالب کے خطوط جلد دوم مرتبہ خلیق انجم ص 502)

مسلمانوں کو آباد ہونے کی اجازت سے قبل مسلمانوں کے اجڑے ہوئے گھروں کی تصویر کشی غالب نے اپنے روزنامچے دستنبو میں کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ ویران گھروں کی در و دیوار پر سبزے اگ آئے ہیں۔ اس قتباس کے زبان و بیان پر غور کریں تو اندازہ ہوگا کہ غالب اس المناک منظر سے کس قدر مضطرب تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

"جنوری 1857 کے آغاز میں ہندوؤں کو فرمانِ آزادی مل گیا اور (شہر میں) آباد ہونے کی اجازت دے دی گئی۔ یہ لوگ (ہندو) جہاں جہاں تھے شہر کی طرف چل پڑے۔ خانماں برباد مسلمانوں کے گھروں میں (خالی پڑے رہنے کے سبب) سبزہ اس قدر اُگ

آیا ہے کہ در و دیوار سبز ہیں، ہر لحظہ سبزۂ سرِ دیوار سے یہ صدا آتی ہے کہ مسلمانوں کی جگہ (بدستور) خالی ہے۔' (دستنبو۔ مترجم شریف حسین قاسمی۔ ص 110)

غالب کے خطوط سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انگریز حکام نے ہندوستانیوں کو دوبارہ آباد ہونے کا پروانہ ضرور دے دیا لیکن ایسی شرطیں بھی لگا دیں کہ لوگ گھروں میں رہتے ہوئے بھی بے گھری کے کرب میں مبتلا ہو گئے۔ انھیں واضح حکم تھا کہ وہ اپنے گھروں میں کرایہ دار تو رکھیں مگر اس کا کرایہ حکومت کو دیں۔ ہندوستانیوں کے حوصلوں کو پست کرنے کے لیے جسمانی، ذہنی اور نفسیاتی جس حد تک انگریز حکام ان پر ظلم کر سکتے تھے، انھوں نے کیے۔ 9/نومبر 1859 کے خط میں غالب، نواب حسین مرزا کو لکھتے ہیں:

''آبادی کا حکم عام ہے۔ خلق کا ازدحام ہے۔ آگے حکم تھا کہ مکان مالک رہیں، کرایہ دار نہ رہیں۔ پرسوں سے حکم ہو گیا ہے کہ کرایہ دار بھی رہیں۔ نہیں یہ نہ سمجھنا کہ تم یا میں کوئی اور اپنے مکان میں کرایہ دار کو آباد کرے۔ وہ لوگ جو گھر کا نشان نہیں رکھتے اور ہمیشہ سے کرایے کے مکان میں رہتے تھے وہ بھی آرہے ہیں، مگر کرایہ سرکار کو دیں۔'' (غالب کے خطوط جلد دوم مرتبہ خلیق انجم ص 679)

انگریزوں نے نہ صرف مکان اور جائداد کے حق سے اہلِ دہلی کو محروم کر دیا تھا بلکہ ایسی صورتحال پیدا کر دی تھی کہ لوگ اپنے گھر اور شہر میں رہتے ہوئے بھی اپنی مرضی سے ہل نہیں سکتے تھے۔ بظاہر جسم آزاد تھے مگر روح کو غلام بنا دیا گیا تھا۔ بغیر اجازت شہر کے اندر یا باہر آنے جانے پر ان پر جرمانہ تو کیا ہی جاتا تھا ساتھ ہی ساتھ انھیں جیل بھی بھیج دیا جاتا تھا جس کا ذکر غالب، غلام نجف خاں کے خط میں فروری 1858 میں کرتے ہیں:

''مجھ کو تم جانتے ہو کہ میرا شہر میں آنا بے اجازت سرکار کے نہیں، ورنہ ممکن بے ٹکٹ نہیں۔ پھر میں کیا کروں؟ کیوں کر وہاں آؤں؟ شہر میں تم ہوتے تو جرات کر کے تمہارے پاس چلا آتا۔'' (غالب کے خطوط جلد دوم مرتبہ خلیق انجم ص 627)

غالب کے خطوط سے اس بات پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ انقلاب [illegible] کے بعد کھانے پینے کی

اشیاء کی زبردست قلت ہوگئی تھی۔ نہ صرف عوام بلکہ امراء کو بھی اشیاءِ خورد ونوش کی کمی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ 18/جولائی 1858 میں غالب اپنا حال بیان کرتے ہوئے مرزا تفتہ کو لکھتے ہیں:

''کئی دن ہوئے۔۔۔۔ جو میں نے ایک ولایتی چغہ اور شالی رومال ڈھائی گزا(پیسوں کی ضرورت کے لیے فروخت کے لیے) دلال کو دیا تھا اور وہ اس وقت روپیہ لے کر آیا۔'' (غالب کے خطوط جلد اول مرتبہ خلیق انجم ص 278)

1857 کے انقلاب کے بعد جب دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا تو انھوں نے آہستہ آہستہ مسجدوں اور امام باڑوں کو منہدم کردیا کیونکہ انقلابیوں نے ان مقامات سے انگریزوں پر حملے کیے تھے جو بہت مضبوط عمارتیں تھیں انھیں بارود کے ذریعہ اڑایا گیا۔ اب سب تفصیلات کا بیان غالب کے خطوط میں ملتا ہے۔ مکانوں، دکانوں اور بازاروں کو اس طرح تباہ برباد کیا گیا کہ ان کا نام ونشان تک باقی نہیں رہا۔ فوج کی رہائش کے لیے قلعہ کے آس پاس کی دکانوں، مکانوں اور فیل خانوں کو منہدم کردیا تاکہ شہر میں رہ کر وہ شہر کے حالات سے باخبر ہوسکیں۔ ان حالات سے غالب کا دل کتنا کڑھتا تھا اس کا اندازہ میر مہدی مجروح کے نام 2/دسمبر 1859 کو تحریر کیے گئے خط سے ہوتا ہے:

''تم آتے ہو، چلے آؤ۔ نثار خان کے چھتے کی سڑک، خان چندن کے کوچے کی سڑک دیکھ جاؤ، بلاقی بیگم کے کوچے کا ڈھینا، جامع مسجد کے گرد ستر ستر گز گول میدان نکلنا سن جاؤ، غالب افسردہ دل کو دیکھ جاؤ، چلے جاؤ۔'' (غالب کے خطوط جلد دوم مرتبہ خلیق انجم ص 515)

ہندوستانیوں پر اتنا ہی ظلم نہیں کیا گیا بلکہ انھیں نفسیاتی طور پر مفلوج کرنے کے لیے اس حکم کے ماننے پر بھی زور دیا گیا کہ 1858 کی پہلی نومبر کو اپنے گھروں میں چراغاں کریں۔ انگریزوں کی مسرت کی وجہ یہ تھی کہ گورنر جنرل لارڈ کینگ کو ہندوستان کا حاکم بنایا جانا تھا۔ انوار الدولہ شفق کو پہلی نومبر کی روداد بیان کرتے ہوئے 5/نومبر 1858 کے خط میں غالب لکھتے ہیں:

''یہاں پہلی نومبر کو (دوشنبہ) کے دن حسب الحکم کوچہ و بازار میں روشنی ہوئی اور شب کو کمپنی کا ٹھیکا ٹوٹ جانا اور قلمرو ہند کا بادشاہی عمل میں آنا سنایا گیا۔ نواب گورنر جنرل لارڈ کیننگ بہادر کو ملکہ معظمہ انگلستان نے 'فرزندِ ارجمند' کا خطاب دیا اور اپنی طرف سے نائب اور ہندوستان کا حاکم کیا۔' (غالب کے خطوط جلد سوم مرتبہ خلیق انجم ص 987)

لارڈ کیننگ کو ہندوستان کا حاکم بنانا ایک تاریخی واقعہ ہے جس کا ذکر غالب کے خطوط میں ملتا ہے غالب کے خطوط سے انقلاب ستاون اور اس وقت کی دہلی کے حالات سے بخوبی واقفیت ہوتی ہے۔ کہیں کہیں ان واقعات کا ذکر تاریخوں کے ساتھ بھی ملتا ہے۔

حامد علی خاں جو سلطنت اودھ کے بھانجے اور داماد تھے۔ وہ اعتماد الدولہ کے انتقال کے بعد دہلی آ گئے تھے۔ ان کے پاس جو بھی سرمایہ تھا، وہ شاہی خزانے میں جمع کرا دیا تھا اور اس سے ملنے والے سود سے اپنا خرچ چلاتے تھے۔ 1857 کے ہنگامے میں وہ بھی شکار ہوئے۔ ان کے متعلق غالب 31/دسمبر 1859 میں نواب حسین مرزا کو لکھتے ہیں:

''مکانات کو حامد علی خاں کا کہہ کر کیوں لکھتے ہو؟ وہ مدت سے ضبط ہو کر سرکار کا مال ہو گیا۔ باغ کی صورت بدل گئی۔ محل سرا اور کوٹھی میں گورے رہتے تھے۔ اب پھاٹک اور سرتاسر دکانیں گرادی گئیں۔ سنگ و خشت کو نیلام کر کے روپیہ داخل خزانہ ہوا۔ مگر یہ نہ سمجھو کہ حامد علی خاں کے مکان کا ملبہ بکا ہے۔ سرکار نے اپنا مملوکہ اور مقبوضہ ایک مکان ڈھادیا۔ جب بادشاہ اودھ کی املاک کا وہ حال ہو تو رعیت کی املاک کو کون پوچھتا ہے؟'' (غالب کے خطوط جلد دوم مرتبہ خلیق انجم ص 682)

انگریزوں نے شاہی خاندان کی عورتوں پر بھی ظلم و ستم کرنے سے گریز نہیں کیا۔ انھیں بھی عوام کی مانند قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں۔ 22 دسمبر 1858 کے خط میں میر مہدی مجروح کو غالب لکھتے ہیں:

''تاج محل (بہادر شاہ کی ایک بیگم) مرزا قیصر (شاہ عالم ثانی کے چھوٹے بھائی، میرزا سلیمان شکوہ کے فرزند) مرزا جواں بخت کے سالے مرزا ولایت علی بیگ جے پوری کی ان

سب کی الہ آباد سے رہائی ہوگئی۔" (غالب کے خطوط جلد دوم مرتبہ خلیق انجم ص500)

غالب اسی خط میں مزید تحریر کرتے ہیں:

"بادشاہ میرزا جواں بخت، میرزا عباس (بہادر شاہ ظفر کے ایک فرزند جو جواں بخت سے چھوٹے تھے) زینت محل، کلکتہ پہنچے اور وہاں سے جہاز پر چڑھائی ہوگی۔ دیکھیے کیپ میں رہیں یا لندن جائیں۔" (غالب کے خطوط جلد دوم مرتبہ خلیق انجم ص500)

فتحِ دہلی کے بعد انگریزوں نے بادشاہ اور اس کے اہل خاندان کو قید کرلیا جس کے سبب یہ افواہ گرم تھی کہ انھیں کیپ میں رکھا جائے گا یا پھر ولایت لے جایا جائے گا۔ ان سب واقعات کا ذکر غالب نے اپنے خطوط میں کیا ہے۔ اخیر میں بادشاہ اور اہل خاندان کو رنگون میں رکھا گیا۔ وہاں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرتے کرتے بادشاہ کی روح پرواز کرگئی۔ غالب 16/دسمبر 1862 کے خط میں میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں:

'7/نومبر، 14 جمادی الاول سال حال (1279ھ، 1862) جمعہ کے دن ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ قید فرنگ و قید جسم سے آزاد ہوگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون (غالب کے خطوط جلد دوم مرتبہ خلیق انجم ص539)

اس مطالعے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ خطوط غالب اردو ادب کا وہ قیمتی سرمایہ ہے جو اردو زبان کو نثر کے ایک اسلوب اور لہجے سے متعارف کراتا ہے۔ ساتھ ہی ان خطوط میں ایسے مواد بھی موجود ہیں جو خط کو رسمی خیر و عافیت کے دائرے سے باہر نکال کر اس کو تاریخ اور تہذیب کی وسیع دنیا سے جوڑتے ہیں۔ ظاہر ہے مکتوب نگار جن حالات سے دوچار ہوگا ان کا عکس مکتوب میں آنا لازمی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان خطوط میں عہدِ غالب کی دلی کے وہ مسائل زیر بحث آئے ہیں جو کہیں نہ کہیں ہندوستانی تاریخ سے اپنا رشتہ رکھتے ہیں اور آنے والے مورخین کے لیے بنیاد فراہم کرتے ہیں۔ خطوط غالب کی یہ وہ خوبی ہے جس سے ہر دور میں ان کی اہمیت باقی رہے گی۔

✿✿✿

پروفیسر غلام یحییٰ انجم

عہد غالب میں دلی کی خانقاہیں

دلی برسوں سے ملک کی راجدھانی رہی ہے اس شہر کو اسی مرکزیت کے باعث پوری دنیا میں عزت وعظمت ملی اور ملک ہندوستان ہی نہیں بلکہ دنیا کے گوشے گوشے سے ارباب علم و دانش اور صاحبان فہم وفراست نے وطن ثانی کے طور پر اسے منتخب کیا۔ جن لوگوں نے اپنی پیدائشی سرزمین کو خیرآباد کہہ کر وطن ثانی کے طور پر دہلی کو منتخب کیا ان کی طویل فہرست ہے، ان منتخب کرنے والوں میں صرف امرا و سلاطین ہی نہیں بلکہ علما، فضلا اور شعرا کے علاوہ کئی اہم مشائخ و بزرگان دین بھی شامل ہیں۔ جن کی طرف اشارہ عصامی نے اپنی شاہکار تصنیف فتوح السلاطین میں ان لفظوں میں کیا ہے۔

بسے سیدان صحیح النسب　　رسیدند روے زملک عرب
بسے کاسبان خراساں زمیں　　بسے نقش بندان اقلیم چیں
بسے عالمانِ بخارا نژاد　　بسے عابد وزاہد از ہر بلاد
زہر ملک ہر جنس صنعت گراں　　زہر شہر ہر اصل کمیں براں
بسے ناقدانِ جواہر شناس　　جواہر فروشاں بروں از قیاس
درآں شہر فرخندہ جمع آمدند　　چوں پروانہ برنو شمع آمدند

(عصامی، فتوح السلاطین ص109 الہ آباد 1938)

ان اشعار کی روشنی میں بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اپنے وطن، مالوف کو چھوڑ کر دہلی کو زیب و زینت بخشنے والوں میں میدان علم وفن کے سپہ سالار بھی تھے اور دنیائے رشد وہدایت کے شہ سوار بھی، اقلیم ادب کے تاجدار بھی تھے اور بحر معرفت کے گوہر آبدار بھی تھے۔ دہلی کو وطن ثانی کے طور پر اختیار کرنے والوں کا جائزہ بھی ایک خاصا وقیع کام ہوگا شاید کوئی اہل قلم اس طرف متوجہ ہو۔

جن صاحبِ فہم وفراست نے دہلی کو وطنِ ثانی کے طور پر منتخب کیا ان میں مرزا اسد اللہ خاں غالب کے آباواجداد میں قوقان بیگ خاں بھی تھے جو اس وقت سمرقند سے ہندوستان آئے، جب ملک ہندوستان میں سلطنت مغلیہ کا چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ مرزا غالب اسی خاندان میں آگرہ (اکبرآباد) میں رجب 1212ھ /دسمبر 1797 کو رات طلوع سحر سے چار گھڑی قبل پیدا ہوئے۔ 9اگست 1810ء امراؤ بیگم سے شادی ہوتے ہی دہلی آنا جانا شروع ہوگیا اور پھر ایک زمانہ وہ آیا کہ غالب ہمیشہ کے لئے دہلی آگئے اور کرائے کا مکان لے کر مستقل سکونت اختیار کرلی۔

مرزا غالب کی شاہانہ خاندان میں ولادت ضرور ہوئی تھی مگر غالب کی زندگی کا بیشتر حصہ عسرت وتنگ دستی کے ماحول میں بسر ہوا۔ طبیعت اخاذ تھی، دانشوری ورثہ میں ملی تھی، شعروسخن کا جذبہ فطری تھا، اصل شوق فارسی کی نظم ونثر کا تھا اور اسی کمال کو وہ اپنا فخر سمجھتے تھے نام اسداللہ ہونے کی بنیاد پر اپنے شعری ذوق کے اظہار کے لئے اسد تخلص فرماتے تھے۔ لیکن جب غالب نے کسی اسد تخلص اختیار کرنے والے شاعر کو یہ شعر سنا

اسد تم نے سنائی یہ غزل خوب ارے او شیر رحمت ہو خدا کی

تو طبیعت میں ایک قسم کا تکدر پیدا ہوا اور اس تخلص سے جی بیزار ہوگیا پھر وہ 1828 میں اسد اللہ الغالب کی رعایت ومناسبت سے غالب تخلص اختیار کرلیا۔ مگر جن غزلوں میں اسد تخلص پہلے سے موجود تھا انہیں چھیڑا نہیں اسی طرح باقی رکھا۔ اسی لئے ان کے دیوان میں دونوں تخلص میں اشعار پائے جاتے ہیں۔

غالب کے فارسی کلام کا معیار اچھا ہے یا اردو کلام کا، یہ تو اہل علم وادب جانیں ہمارا دونوں سے واسطہ نہیں، اتنا ضرور جانتے ہیں کہ ''گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل'' کے بمصداق غالب مشکل پسند شاعر تھے ان کے یہاں مشکل پسندی کی جلوہ گری دونوں زبانوں کی شاعری میں یکساں طور پر پائی جاتی ہے۔ مثل مشہور ہے کل شئی یترشح من الاناء بمافیہ برتن سے وہی ٹپکتا ہے جو برتن میں ہوتا ہے غالب کی شاعری کتنے علمی خصائص اور فکری محاسن کا مجموعہ ہے جو بحر علم وفن کا شناور ہیں وہ اچھی طرح محسوس کرسکتے ہیں۔ ہم تو نسیم قریشی کی زبان میں اتنا کہہ سکتے ہیں:

''غالب ایک ہمہ رنگ قسم کے آدمی تھے، کبھی وہ فلسفی معلوم ہوتے ہیں، کبھی وہ صوفی روحانیت میں ڈوب جاتے ہیں، کبھی زندگی اور مستی کے ترانے الاپتے ہیں اور کبھی باغیانہ تیور کے ساتھ صدیوں کی بنی بنائی روایتوں اور قدروں پر استہزا کرتے ہیں لیکن ہر حال میں ان کا یہ امتیازی وصف نمایاں رہتا ہے۔ جو چیز بھی ان کے قلم سے نکلی ہے گہری فکری آنچ میں تپی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔'' (نسیم قریشی۔ اردو ادب کی تاریخ ص 11 آزاد کتاب گھر کلاں محل دہلی)

غالب اور ان کی شاعری اس وقت یہاں موضوع بحث نہیں یہاں سطور بالا میں روحانیت میں ڈوب جانے کی طرف جو اشارہ نسیم قریشی نے کیا ہے تھوڑی دیر میری گفتگو کا محور وہی جملہ ہوگا۔ جب اس تعلق سے ہم غالب کی شخصیت کا مطالعہ کرتے ہیں تو وہ ہمیں پوری طرح تصوف کے رنگ میں رنگے ہوئے نظر آتے ہیں جس کی طرف خود غالب نے اپنے اس شعر میں اشارہ کیا ہے۔

یہ مسائل تصوف یہ تیرا بیان غالب	تجھے ہم ولی سمجھتے، جو نہ بادہ خوار ہوتا

غالب نے اپنی شاعری میں تصوف کے جن مسائل کو موضوع بنایا ہے اس کا مطالعہ بھی خاصے کی چیز ہوگی، بشمول وحدۃ الوجود ایسے مسائل کو انہوں نے اپنی شاعری میں جگہ دی ہے جو انتہائی اہم ہیں۔ غالب نے اپنے اس شعر میں جس بادہ خواری کا ذکر کیا ہے اگر سرور و مستی کا جام چھوڑ کر غالب بادۂ معرفت کے جرعہ نوش ہو جاتے تو آج وہ اپنی دقیقہ سنجی و مشکل پسندی کے باعث ابن العربی جیسے مشکل پسند صوفیاء کی صف میں شمار کیے جاتے۔ مگر ایسا نہ ہو سکا البتہ جس میدان میں انہوں نے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں بلا شبہ اس میدان میں پیر مغاں نظر آتے ہیں۔

تصوف کے تعلق سے تمام خیالات فارسی شاعری سے، اردو شاعری میں آئے، ان میں وہ شعرا جو واقعی صاحب حال صوفی تھے جیسے خواجہ میر درد جو اپنے ذکر و فکر سے عین الیقین اور پھر حق الیقین کی منزلوں تک پہنچے۔ غالب کی شاعری میں تصوف کی چاشنی کہیں کہیں ملتی ہے اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں وہ صوفی شاعر تھے بلکہ انہوں نے خواجہ میر درد کی طرح تصوف کے اصول کو عملی طور پر نہیں

بلکہ فکری اور تخیلاتی انداز میں تسلیم کیا ہے۔ بقول ڈاکٹر یوسف حسین خاں:

''غالب کے یہاں اگر کوئی عقیدہ ملتا ہے تو وہ وحدت الوجود ہے جس کی رو سے موجودات کی حیثیت محض اعتباری ہے اصل ہستی واجب تعالیٰ کی ہے، جس کے جلوے سے کائنات معمور ہے، جو کچھ ہے وہ ایک ہی ذات کا جلوہ ہے۔ وہ تمام صفت کا سرچشمہ اور ماخذ ہے، اس لیے کسی ایک صفت کا اس پر اطلاق نہیں کیا جا سکتا وہ کائنات کی ہر شئے میں ہے لیکن کوئی شے واجب تعالیٰ نہیں۔

ہر چند ہر ایک شئ میں تو ہے پر تجھ سے تو کوئی شئ نہیں ہے

(یوسف حسین خاں۔ غالب اور آہنگ غالب، غالب اکیڈمی دہلی، دسمبر 1968 ص 231)

ان سطور بالا کی روشنی میں بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ غالب خالصتاً موحد تھے لا الـہ الااللہ، لاموجود الااللہ، اور لاموثر فی الوجود الااللہ پر ان کا ایمان کامل تھا۔ وہ تمام انبیائے کرام کو واجب التعظیم سمجھتے تھے۔ مبدء کائنات حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو ختم المرسلین ورحمۃ للعالمین اور حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ کو مبدء امامت جانتے تھے ان کا عقیدہ تھا کہ امامت کی آخری کڑی مہدی موعود ہوں گے۔ موحد تو اس درجہ تھے کہ بقول غالب:

''میں موحد ہوں ہمیشہ تنہائی اور سکوت کے عالم میں یہ کلمات میری زبان پر جاری رہتے ہیں لا الہ الا اللہ، لاموجود الا اللہ، اور لاموثر فی الوجود الا اللہ۔ میر نصیر الدین اولاد میں سے ہیں شاہ معظم کے، وہ خلیفہ تھے مولوی فخر الدین صاحب کے اور میں مرید ہوں اور خاندان کا صوفی صافی ہوں میں بنی آدم کو مسلمان یا ہندو یا نصرانی سب کو عزیز رکھتا ہوں گنتا ہوں دوسرا مانے یا نہ مانے۔

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

(مرتبہ حفیظ عباسی، کہانی میری زبانی میری ص 20 دہلی 1968)

غالب کو تصوف سے کس درجہ ربط تھا اس کا پیمانہ تو متعین نہیں کیا جا سکتا ہے لیکن بعض ادیبوں نے اس کا برملا اعتراف ضرور کیا ہے کہ غالب کو جس نے غالب بنایا اور انہیں ان کے معاصرین

میں ممتاز کیا، وہ تصوف سے گہری وابستگی ہی تھی۔ یادگار غالب کے مصنف لکھتے ہیں:

''علم تصوف جس کی نسبت کہا گیا ہے ''برائے شعر گفتن خوب است'' سے ان کو خاص مناسبت تھی اور حقائق و معارف کی کتابیں و رسالے کثرت سے ان کے مطالعہ سے گذرے تھے اور سچ پوچھئے تو انہی متصوفانہ خیالات نے مرزا کو نہ صرف اپنے ہم عصروں میں بلکہ بارہویں اور تیرہویں صدی کے تمام شعرا میں ممتاز بنا دیا تھا۔'' (الطاف حسین حالی۔ یادگار غالب ص70 دہلی 1981)

غالب کو مذہب سے کتنا لگاؤ تھا اس تعلق سے ماہرین غالبیات نے بہت کچھ لکھا ہے ہم تو اتنا جانتے ہیں کہ غالب صرف ایک مذہب پرست تھے وہ شیعہ تھے کہ سنی اس سے قطع نظر ان کے یہاں شریعت اور طریقت کے اصولوں میں کوئی اختلاف نہیں تھا، ان کے نزدیک طریقت کا تعلق بالعموم انسان کے تزکیہ نفس اور اس کی ذاتی روحانی تربیت سے ہوتا ہے اور شریعت انسان کے افعال کو اجتماعی نقطہ نظر سے دیکھتی ہے۔ اسی سبب سے مرزا کا اپنا رنگ، طریقت سے قریب تر تھا اور وہ شریعت کی اہمیت سے بھی غافل نہ تھے۔ ان کی زندگی میں ''با خدا دیوانہ باش و با محمد ہوشیار'' کا فلسفہ پوری طرح رچا بسا تھا۔ جہاں وہ سرکار دو عالم ﷺ کا ذکر کرتے ہیں وہاں وہ آداب کے اصول و آئین کو پوری طرح ملحوظ خاطر رکھتے ہیں۔ مگر خدائے تعالیٰ کے تعلق سے ان کے کئی اشعار مفتیان کرام کے نزدیک قابل گرفت ہیں۔ ایسا کیوں ہے اس کی وجہ بھی غالب نے اپنے شعر میں بیان کردی ہے۔

رموز دیں نشناسم درست و معذورم نہادِ من عجمی و طریق من عربی است (غالب نمہ ماکرام ص147)

مرزا غالب نماز و روزہ کے پابند تھے کہ نہیں اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا البتہ جب وہ رام پور پہونچے ہیں تو انہوں نے وہاں کی اپنی مذہبی زندگی کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے وہ لکھتے ہیں:

''رمضان کی چاندرات کے دن یہاں پہونچا یک شنبہ کو غرہ ماہ مقدس ہوا اسی دن سے ہر صبح کو حامد علی خاں کی مسجد میں جا کر جناب مولوی جعفر علی صاحب سے قرآن سنتا ہوں شب کو مسجد جا کر نماز تراویح پڑھتا ہوں کبھی جو جی میں آتا ہے تو وقت صوم مہتاب باغ

میں جا کر روزہ کھولتا ہوں اور سرد پانی پیتا ہوں واہ واہ کیا اچھی طرح عمر بسر ہوتی ہے۔''

(مرتبہ حفیظ عباسی، کہانی میری زبانی میری ص30 دہلی 1968)

مرزا غالب کا یہاں رواداری اور وحدانیت کا نظریہ کافی ترقی پذیر نظر آتا ہے جیسا کہ بنارس کے تعلق سے جو کچھ انھوں نے لکھا ہے یہ تصور بدرجہ اتم وہاں موجود ملتا ہے۔ ان کے یہاں ہر عقیدہ درست ہے۔ سب کو ہی منزل مقصود تک پہنچانے کا ذریعہ سمجھتے ہیں، جس طرح ہمارے بعض دانشوروں نے اس شعر کے سمجھنے میں غلطی کی ہے اسی کی عکاسی غالب کے یہاں بھی پائی جاتی ہے۔

ہر قومے راست راہے دینے وقبلہ گاہے   من قبلہ راست کردم بہ سمتِ کج کلاہے

حضرت امیر خسرو نے اپنے پیر و مرشد محبوب الٰہی حضرت نظام الدین اولیاء علیہ الرحمۃ والرضوان کے لیے لکھا تھا کہ ہر قوم کے لئے اپنا ایک جداگانہ راستہ ہے جداگانہ دین ہے جداگانہ قبلہ ہے۔ میں نے اپنا قبلہ اسی کج کلاہ کو بنالیا ہے، مگر ہمارے بعض دانشوروں نے راست کو دونوں شعر میں درست اور سیدھا کے معنی میں لیا جب کہ پہلے مصرع میں راست را اور است سے مرکب ہے جس کے معنی'' کا ہے، کو ہے'' کے ہیں اور دوسرے شعر میں راست درست اور سیدھا کے معنی میں ہیں۔ اب اس طرح اس شعر کو پڑھنے سے شعر کا مفہوم بالکل واضح ہوجاتا ہے۔

اس لئے کہ خدا تک پہنچنے کا جو سیدھا راستہ اور صراط مستقیم ہے وہ صرف دین اسلام میں ہے۔ عہد حاضر میں باقی تمام مذاہب میں وہ صلاحیت نہیں۔ مگر بنارس کے حسن و زیبائش سے مرزا غالب اس درجہ متاثر ہوئے کہ اس سرزمین کو باشندگان بنارس کی روحوں کے لئے برزخ قرار دے ڈالا اور یہ لکھ ڈالا کہ اس سرزمین میں ایسی تاثیر ہے کہ جس کے فنا ہوجانے کے بعد بھی روح یہاں سے نقل مکانی نہیں کرنا چاہتی ہے اور ہمیشہ کے لئے یہیں رہنا چاہتی ہے اور یہ عقیدہ سراسر مذہب اسلام کے خلاف ہے۔

شگفتی نیست از آب ہوائش   کہ تنہا جاں شود اندر فضائش

اس رواداری اور وحدانیت کے باوجود بقول کمال احمد صدیقی:

''غالب کے یہاں انسان کی وحدانیت کا جو خیال کہیں کہیں ملتا ہے وہ تصوف کی دین بھی

ہوسکتا ہے اور ان کے قیام کلکتہ کے اثرات کی بھی'' (غالب کی شناخت غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی ص36، دہلی 1997)

اس قدر انسان دوستی اور انسانی وحدانیت کے باوجود غالب خانقاہی تھے کہ نہیں یہ تو حتمی طور پر نہیں کہا جا سکتا، تاہم اتنا مسلم ہے کہ خانقاہیوں اور خانقاہی مزاج رکھنے والوں سے ان کے مستحکم روابط تھے۔ مولانا فضل حق خیر آبادی جو غالب کے یار غار تھے اور بہت سے امور معاملات میں ان سے مشورے بھی لیا کرتے تھے۔ غالب پچیس سال کی عمر ہی میں ان کے حلقۂ اثر میں شامل ہوگئے تھے۔ غالب کی اردو شاعری میں سہل پسندی بھی علامہ فضل حق خیر آبادی کی صحبت ہی کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔ غالب پر علامہ کا اتنا اثر تھا کہ علامہ کے تعلقات سے پہلے کہی ہوئی دو سو اڑسٹھ غزلیں جو ایک ہزار چار سو اٹھانوے اشعار پر مسودے کی شکل میں محفوظ تھیں قلم زد کردیں۔ محمد حسین آزاد انتخاب کلام غالب اور دیوان غالب کے بارے میں اپنی معلومات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سن رسیدہ اور معتبر لوگوں سے معلوم ہوا ہے کہ ان کا دیوان بڑا تھا، یہ منتخب ہے مولوی فضل حق خیر آبادی فاضل بے عدیل تھے، جو ایک زمانے میں دہلی عدالت کے سررشتہ تھے۔۔۔ انہوں نے اکثر غزلوں کو سنا اور دیوان کو دیکھا تو مرزا صاحب کو سمجھایا کہ یہ اشعار عام لوگوں کی سمجھ میں نہ آئیں گے، مرزا نے کہا، جو کچھ کر چکا اب کیا تدارک ہوسکتا ہے، انہوں نے کہا خیر جو ہوا سو ہوا انتخاب کرو اور مشکل شعر نکال ڈالو مرزا صاحب نے دیوان حوالے کردیا دونوں صاحبو نے دیکھ کر انتخاب کیا وہ یہی دیوان ہے جسے آج عینک کی طرح لوگ آنکھوں سے لگائے پھرتے ہیں۔'' (آب حیات محمد حسین آزاد ص512 لکھنو 1982)

خانقاہی علماء فضلا کے علاوہ مرزا غالب کے خانقاہی مشائخ کرام سے بھی گہرے روابط و مراسم تھے۔ سلسلۂ قادریہ کے مشہور بزرگ حضرت غوث علی شاہ قلندر ایک مرتبہ گھومتے پھرتے دہلی پہونچے، زینت المساجد دریا گنج دہلی میں قیام فرمایا، سید صاحب پہلی مرتبہ خود ہی مرزا غالب سے ملنے گئے پھر بعد میں 6/ ماہ تک مرزا صاحب وقتاً فوقتاً سید صاحب سے ملنے زینت المساجد جاتے رہے، سید صاحب نے اپنے ملفوظات میں دو مقام پر مرزا غالب کا ذکر کیا ہے اور مرزا کے اکثر

اشعار بھی نقل فرمائے ہیں، آپ نے غالب کے اخلاق و عادات کی تصویر جس انداز سے کھینچی ہے ان سے خود سید صاحب کے اخلاق عالیہ پر روشنی پڑتی ہے۔

غالب کا تعلق صوفیاء و مشائخ سے کس قدر تھا اور ان کی خانقاہوں کا ان کی نظر میں کتنا احترام تھا یہ تو نہیں کہا جا سکتا لیکن تصوف سے لگاؤ اور مسائل تصوف سے دلچسپی سے ان کی شاعری میں جابجا ذکر سے پتا چلتا ہے کہ ان کی دلچسپی نہ تو صوفیاء سے کم تھی اور نہ ہی مسائل تصوف سے۔ یوں تو شہر دہلی ہر زمانے میں صوفیاء و مشائخ کا ذکر رہا ہے۔ صدیوں یہ شہر 22 خواجگان کی چوکھٹ سے مشہور و معروف ہے تاریخ اولیائے دہلی کے مصنف لکھتے ہیں۔

> ''دلی بائیس خواجہ کی چوکھٹ کہلاتی ہے اور اس سے مراد 22 چیدہ برگزیدہ خواجہ ہیں غور سے دیکھا جائے تو سیکڑوں بزرگ ایک سے بڑھ کر ایک سرزمین دہلی میں آسودۂ خواب ہیں جن کے حالات سے تاریخ کی کتابیں معمور ہیں اور سچ بات تو یہ ہے کہ بہت سے اہم کمالات کے حالات تاریخ میں لکھے ہی نہیں گئے کہ ان بزرگوں نے اپنی شہرت سے اجتناب کیا نہ خود لکھا نہ ہی دوسروں کو لکھنے دیا۔'' (احمد سعید، اولیاء دہلی ص 243)

دہلی میں قائم اگر درگاہوں اور خانقاہوں کا جائزہ لیا جائے تو یہ ایک اچھا کام ضرور ہوگا مگر اس کے لیے وقت اور صلاحیت دونوں کی ضرورت ہے جو راقم السطور کے پاس نہیں۔ یہ واضح کر دینا ضروری ہے جب ہم درگاہ کا استعمال کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ وہاں شیخ کا مزار مقدس ہے اور اس کے انتظام و انصرام کے لیے وارثین موجود ہیں عقیدت مند وہاں آتے ہیں اور قلبی طمانیت حاصل کرتے ہیں، مگر خانقاہ کا جب لفظ بولا جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہاں مزارات شیوخ کے علاوہ مشائخ طریقت بھی موجود رہتے ہیں اور رشد و ہدایت کا سلسلہ صبح و شام جاری رہتا ہے بندگان الٰہی اطراف عالم سے آتے اور وہاں اپنے مضطرب دل کو سکون و قرار عطا کرتے ہیں، اس وضاحت کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے عہد غالب میں درگاہوں کی تعداد کم نہ تھی۔ دہلی کے اندر ہر دور میں صوفیا و مشائخ کے باعث خانقاہوں کی کثرت تھی۔ اس کا اندازہ پروفیسر خلیق احمد نظامی کے اس قول سے لگایا جا سکتا ہے۔

''محمد بن تغلق کے زمانے میں دہلی میں دو ہزار خانقاہیں تھیں، صوفیہ کے مراکز مختلف نوعیت کے تھے۔ خانقاہیں، جماعت خانے، زاویئے، دائرے سب میں تھوڑا تنظیم اور ماحول کا فرق ہوتا تھا، صوفیہ کے ان مرکزوں میں چھوٹے بڑے امیر و غریب ہندو مسلمان مرد و عورت سبھی حاضر ہوتے تھے۔ اکثر گفتگو ہندوی میں ہوتی تھی۔ بیشتر مشائخ دربار سے دور رہتے اور درباداری کی سعادت کو روحانی سعادت کے منافی سمجھتے تھے۔''

(دلی تاریخ کے آئینے میں ص 44 دہلی 1989)

دہلی کی یہ درگاہیں کسی نہ کسی سلسلہ سے منسوب ہوتی تھیں۔ ہندوستان میں جو مشہور سلسلے رائج ہیں ان میں ہر ایک کی درگاہیں اور خانقاہیں دہلی میں موجود ہیں، جہاں سے صوفیاء و مشائخ دینی و تبلیغی سرگرمیاں جاری رکھتے تھے۔ سلطان الہند حضرت خواجہ غریب نواز نے دہلی کی سرزمین کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے سرفراز ضرور کیا مگر دہلی میں مستقل سکونت کے لئے اپنے جانشین قطب الاقطاب حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کا انتخاب کیا اور خود اجمیر معلی سکونت پذیر ہوئے۔ ہندوستان میں سلسلہ نقش بندیہ کے بانی حضرت خواجہ باقی باللہ خود دہلی میں آسودۂ خواب ہیں۔ سلسلہ قادریہ کے مشہور بزرگ حضرت ابراہیم ایرجی درگاہ نظام الدین اولیاء اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی حوض شمسی مہرولی شریف میں آرام فرما ہیں۔ سلسلہ سہروردیہ کے بانی حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی کے خلیفہ خاص حضرت حمید الدین ناگوری مہرولی شریف میں آرام فرما ہیں۔ ان مقدس نفوس کے علاوہ محبوب الٰہی حضرت نظام الدین اولیاء، حضرت سید نورالدین مبارک غزنوی، حضرت حاجی مجد الدین خلیفہ شیخ شہاب الدین سہروردی، شیخ ابوبکر طوسی حیدر حضرت شیخ رکن الدین فردوسی، حضرت شاہ کلیم جہاں آبادی، حضرت شاہ عبدالرحیم نقشبندی، حضرت مظہر جان جاناں نقش بندی، حضرت خواجہ میر درد، حضرت مولانا فخرالدین، حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی، حضرت شاہ جلال تبریزی، حضرت شاہ غلام علی نقش بندی، حضرت سیدنا شاہ محمد آفاق نقش بندی، حضرت میاں مستان شاہ کابلی، حضرت ابوالحسن عین الدین امیر خسرو چشتی، حضرت سلطان شمس الدین التمش رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین جیسے کئی ایسے اہم مشائخ و بزرگان دین دہلی کی سرزمین میں آرام

فرما ہیں جن کے روحانی فیوض و برکات سے ہزار بدعنوانیوں اور سماجی خرافات کے باوجود دہلی کی چمک دمک قائم ودائم ہے۔ ان تمام پر تبصرہ اور اظہار خیال ایک مشکل امر ہے موضوع کی مناسبت سے یہاں صرف ان خانقاہوں کا ذکر سود مند ہوگا جو مرزا غالب کے عہد یا اس سے متصل ادوار میں رشد و ہدایت میں مصروف تھیں اور اپنے اپنے روحانی فیوض و برکات سے نہ صرف باشندگان دہلی بلکہ تمام متلاشیان حق کے دل و دماغ کو اسلام کی روشنی سے منور و تاباں کر رہی تھیں اور ان کا فیضان عوام وخواص سب کے لیے چشمۂ سیال کی طرح جاری وساری تھا۔ جو مشائخ کرام عہد غالب یا اس سے متصل عہد میں اپنی خانقاہوں میں بیٹھ کر وحدانیت کا پرچم بلند کرنے کے علاوہ خلق خدا کو انسانیت کا درس دے رہے تھے ان میں درج ذیل مشائخ بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

حضرت مرزا مظہر جان جاناں دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ:

مرزا مظہر جان جاناں شہید رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ (1111ھ۔1195ھ) حضرت سید نور محمد بداوٗنی کے خلیفہ تھے۔ آپ کا نام شمس الدین حبیب اللہ تھا، مظہر تخلص تھا۔ والد ماجد کا نام مرزا جان تھا اسی مناسبت سے اورنگ زیب عالم گیر نے جانِ جاناں نام رکھا کہ فرزند جان پدر ہوتا ہے۔ یہی نام خلق خدا کی زبان پر چڑھ گیا اور اسی نام سے مشہور ہوگئے۔ علوی سادات سے نسبی تعلق تھا سلسلہ نسب 28 واسطوں سے حضرت محمد بن حنفیہ کے توسط سے امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم پر منتہی ہوتا ہے۔ آپ کے آبا واجداد امراء سے تھے سلاطین تیمور سے ان کے گہرے مراسم تھے۔ آپ کے اہل خاندان اپنے محاسن وکمالات، عدالت وشجاعت سخاوت وکمال دین داری میں مشہور زمانہ تھے۔ آپ کے والد ماجد شاہانہ شان وشوکت چھوڑ کر فقر وقناعت کی راہ اختیار کی اور جو کچھ آپ کے پاس دولت تھی اسے آپ نے فقرا ومساکین پر خرچ کر کے طالب راہ حق ہوگئے حضرت شاہ غلام علی اپنے پیر ومرشد مرزا مرزا مظہر جان جاناں کے احوال کوائف میں لکھتے ہیں۔

> ”والد ماجد حضرت ایشاں مرزا جاناں ترک جاہ و دولت ومنصب بادشاہی کردہ سلطنت فقر وقناعت اختیار کردند و اسباب جاہ وحشم خوادر ادرراہ مولیٰ بر فقر اقسمت فرمودہ بست وپنج ہزار روپیہ بجہت نکاح صبیہ خود داشتہ بودند شنیدند کہ یکے از دوستان ایشاں را حاجت صعب پیش

آمدہ آں زر تمام بوے عطا فرمودند۔'' (حالات ومقامات حضرت مظہر جان جاناں ص 16)

18 سال کی عمر میں حضرت نور محمد بدایونی رحمہ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بیعت وارادت کا شرف حاصل کیا۔ اپنے والد ماجد اور قاری عبدالرسول، حضرت حاجی محمد افضل علیہم الرحمۃ والرضوان سے علوم متداولہ کی تکمیل فرمائی۔ سماع کے جواز کے قائل تھے حضرت شاہ غلام علی فرماتے ہیں۔

''می فرمودند السماع یورث الرقۃ اولرقۃ یجلب الرحمۃ بس آنچہ موجب رحمت الہی باشد چرا حرام بود و حرمت مزامیر اختلاف نیست، مگر دف در اعراس مباح گفتہ اند، ولی را مکروہ۔ روزے رسول خدا ﷺ در راہے می رفتند آوازنی بسمع بارک رسید گوش خود بند فرمودند وعبداللہ بن عمر ہمراہ بود اور ابعدم استماع امر کردند، پس معلوم شد کہ کمال تقویٰ در احتراز از چنیں آواز ست بزرگان نقش بندیہ کہ عمل بعزیمت معمول دارند واز رخصت اجتناب از سماع پرہیز می نمایند کہ در جواز غنا علماء را اختلاف است و ترک مختلف فیہ اولی، ہم چنیں از کمال تقوی ذکر خفی اختیار نمودہ ذکر جہر موقوف داشتہ اند۔'' (شاہ غلام علی، حالات ومقامات حضرت مظہر جان جاناں ص 42،43 مطبع احمدی 1269ھ)

آپ کے دور میں دہلی کی سرزمین پر عشق الہی کا بازار روز وشب عروج پر رہا جس کی طرف اشارہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے ان لفظوں میں کیا ہے فرماتے ہیں:

''ہندوستان کے لوگوں کے حالات ہم سے پوشیدہ نہیں کہ یہیں کی پیدائش ہے اور یہیں عمر بسر ہوئی۔ ملک عرب کو خود دیکھا ہے اور اس کی سیاحت کی ہے افغانستان وایران کے لوگوں کے حالات وہاں کے معتبر لوگوں کی زبانی سنے ہیں اس سب کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوا کہ کوئی ایسا بزرگ جو جادۂ شریعت اور طریقیت پر اور کتاب وسنت کی پیروی میں ان کی طرح استوار ومستقیم ہو اور طالبین کی رہنمائی میں اس کا پایہ اتنا بلند اور اس کی توجہ اتنی قوی ہو ہمارے دور میں ان ملکوں میں سے کسی ملک میں جن کا اوپر ہم نے تذکرہ کیا پایا نہیں جاتا۔ دور ماضی اور بزرگان سلف میں بے شک ہوسکتا ہے بلکہ سچ پوچھیے تو ہر زمانے میں ایسے بزرگ زیادہ تعداد میں پائے جاتے چہ جائے کہ ایسے زمانہ میں جو فتنہ و

فساد سے پر ہے۔'' (کلمات طیبات ص 164,165)

حضرت مرزا مظہر جان جاناں کی خانقاہ بڑے بڑے علماء فضلا کے لئے آماجگاہ تھی۔ ارباب فضل و کمال نے آپ کے دست حق پرست پر بیعت وارشاد کا شرف حاصل کیا ہے، ایسے لوگوں کی تعداد ہزاروں میں ہے مگر آپ کے خلفا جن کے ذریعہ سلسلہ کو برصغیر میں فروغ ملا ان میں بقول ابوالحسن علی میاں ندوی:

''حضرت مولانا نعیم اللہ بہرائچی (1153ھ۔1218ھ) مصنف ''معمولات مظہریہ'' اور بیہقی وقت حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی (وفات 1225ھ) مصنف ''تفسیر مظہری'' و ''مالابدمنہ'' اور مولانا غلام یحییٰ بہاری (وفات 1180ھ) جیسے سرآمد روزگار و مشائخ تھے۔'' (تاریخ دعوت عزیمت حصہ چہارم ص 381)

مرزا مظہر جان جاناں کے خلفاء میں قاضی ثناء اللہ پانی پتی بہت مشہور ہیں، شاہ عبدالعزیز انہیں ''بیہقی وقت'' کہا کرتے تھے وہ کئی کتابوں کے مصنف تھے ان میں فقہ کے مسائل کی کتاب مالا بدمنہ اب بھی مستعمل ہے اس کے علاوہ انہوں نے سات جلدوں میں تفسیر مظہری لکھی اس زمانہ میں شاہان اودھ کی وجہ سے شیعہ سنی مسئلہ پھر پیدا ہوگیا تھا، چنانچہ قاضی صاحب شیعہ عقائد کے خلاف سیف المسلول کے نام سے ایک رسالہ لکھا اس کے علاوہ ارشاد الطالبین، حقوق الاسلام، شہاب ثاقب اور دوسرے رسائل آپ کی یادگار ہیں۔ آپ کی وفات 1805 میں ہوئی۔ (محمد اکرام رود کوثر ص 649 دہلی 1991)

حضرت مولانا شاہ عبداللہ غلام علی دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ:

آپ کا اصل نام عبداللہ تھا غلام علی کے نام سے شہرت حاصل کی۔ نام کی وجہ تسمیہ کے تعلق سے سرسید احمد خاں لکھتے ہیں:

''حضرت شاہ غلام علی کی پیدائش سے پہلے آپ کے والد مکرم نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خواب میں دیکھا کہ فرماتے ہیں عنقریب تمہارے یہاں لڑکا پیدا ہونے والا ہے اس کو میرے ہمنام کرنا اور آپ کی والدہ ماجدہ نے کسی بزرگ کو دیکھا انہوں نے عبدالقادر آپ کا نام رکھا اور آپ کے عم بزرگوار نے جناب رسول خدا ﷺ کی اشارت

سراپا بشارت سے عبداللہ آپ کا نام رکھا اور اسی سبب سے آپ کا اصلی نام عبداللہ اور عرف غلام علی تھا۔ (آثار الصنادید باب چہارم ص 16 علی گڑھ 2007ء)

امرتسر پنجاب میں ایک بستی وتالہ ہے وہیں کے رہنے والے تھے۔ 1152ھ میں ولادت ہوئی اور 1240ھ میں وصال ہوا۔ شجرۂ نسب مولی علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم پر منتہی ہوتا ہے۔ بڑے عابد و زاہد تھے جنگلوں میں ذکر کیا کرتے تھے درختوں کے پتی پر قناعت فرماتے تھے، چالیس دن لگاتار نہیں سوتے تھے۔ اکثر بڑے بڑے اولیائے کرام کی روحوں کا مشاہدہ کیا کرتے تھے۔ حضرت شاہ ناصر الدین قادری سے شرف بیعت تھا، چشتیہ اور شطاریہ سلسلہ سے بھی نسبت رکھتے تھے۔

آپ کے والد مکرم نے اپنے پیر و مرشد حضرت شاہ ناصر الدین قادری جو حضرت خضر علیہ السلام کی صحبت میں رہے، بیعت کرانے کے لئے وتالہ سے دہلی بلایا۔ آپ کے دہلی پہنچنے سے پہلے حضرت ناصر الدین قادری اللہ کو پیارے ہوگئے تو والد ماجد نے فرمایا میں نے اپنے پیر و مرشد سے تمہیں بیعت کرانے کے لئے بلایا تھا لیکن تقدیر میں نہ تھا اب تمہیں جہاں اطمینان ہو بیعت ہو جاؤ۔ 1180ھ میں 22 سال کی عمر میں آپ نے مرزا مظہر جان جاناں علیہ الرحمہ سے بیعت کی اور بیعت سے سرفراز ہونے کے بعد یہ شعر پڑھا۔

از برائے سجدہ عشق آستانے یافتم　　سرزمینی بود منظور آسمانے یافتم

بیعت کے بعد سالہا سال اپنے پیر و مرشد کی خدمت میں رہے اور زہد و مجاہدہ اور ریاضت اس قدر تھی کہ [illegible] سے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اسی باعث اپنے وقت کے شیخ الشیوخ اور صاحب ارشاد ہوئے اور تلقین و ارشاد کا سلسلہ اپنے پیر و مرشد کی موجودگی میں ہی ظاہر فرمایا، اگرچہ آپ نے بیعت سلسلہ قادریہ میں کی تھی مگر ذکر و اذکار اور شغل و اشغال طریقہ علیہ نقشبندیہ مجد[illegible] جاری کیا اور ہر طریقہ کی اجازت حاصل کی اور پیر و مرشد کے انتقال [illegible] سجادہ نشین ہوئے۔ (محمد اکرام، رود کوثر ص 251 دہلی 1991)

تصوف میں ان کی خدمات کو دیکھتے ہوئے بعض اہل قلم نے [illegible] میں سلسلہ مجددیہ کا نہیں بلکہ تیرھویں صدی میں سلوک الی اللہ اور تزکیہ و احسان کا [illegible] ب ہوگا۔ آپ کی

خانقاہ میں دور دراز کے لوگوں کا ہمیشہ میلا لگا رہتا جو بھی آپ کی خانقاہ میں اپنے خالی دامن لے کر آتا گوہر مراد سے دامن بھر کر لے جاتا آپ کے خلفا کی تعداد سیکڑوں میں ہے۔ پنجاب کے شہر انبالہ میں صرف آپ کے پچاس خلفا تھے۔ ہمیشہ آپ کی خانقاہ میں فیض یافتگان کی بھیڑ رہتی پانچ سو آدمی سے کم نہیں ہوتے سب کے روٹی کپڑے کا اہتمام آپ کے ذمہ ہوتا باوجودیکہ کہیں سے ایک حبہ وظیفہ مقرر نہیں تھا اللہ تعالیٰ غیب سے آپ کی مدد فرماتا تھا۔ اس پر سخاوت اس قدر تھی کہ کبھی کوئی سائل آپ کی خانقاہ سے محروم نہیں پھرتا جو مانگتا اسے مل جاتا۔ جو عمدہ چیز تحفہ میں آپ کے پاس آتی اسے آپ فقرا و مساکین پر صرف فرماتے، جیسا موٹا کپڑا تمام فقرا پہنتے ویسا ہی آپ بھی پہنتے جو سب لوگ کھاتے وہی لکھانا آپ بھی تناول فرماتے، الغرض مزاج میں بڑی سادگی تھی۔ آپ کی خانقاہ میں جو رونق اور روحانیت تھی سر سید اس کے چشم دید گواہ ہیں، لکھتے ہیں۔

> ”میں نے حضرت کی خانقاہ میں اپنی آنکھ سے روم و شام اور بغداد و مصر و چین اور حبش کے لوگوں کو دیکھا ہے کہ حاضر ہو کر بیعت کی اور خدمت خانقاہ کو سعادت ابدی سمجھے اور قریب قریب کے شہروں کا مثل ہندوستان، پنجاب اور افغانستان کو تو کچھ ذکر نہیں کہ ٹڈی دل کی طرح امنڈتے تھے سچ ہے۔

چوکعبہ قبلہ حاجات شد ازدیار بعید   روند خلق بدیدارش از بسے فرسنگ

> حضرت کی خانقاہ میں پانچ سو فقیر سے کم نہیں رہتا تھا اور سب کا روٹی کپڑا آپ کے ذمہ رہتا تھا اور باوجودیکہ کہیں سے ایک حبہ مقرر نہ تھا، اللہ تعالیٰ غیب الغیب سے کام چلاتا تھا، اس پر فیاضی اور سخاوت اس قدر تھی کہ کبھی سائل کو محروم نہیں پھیرا جو اس نے مانگا وہ دے دیا۔“ (سر سید آثار الصنادید باب چہارم ص 18 مطبوعہ علی گڑھ 2007ء)

جس طرح آج کل جسمانی امراض میں مبتلا لوگوں کی بھیڑ بڑے ہسپتالوں میں ہوتی ہے اس سے کہیں زیادہ بھیڑ روحانی امراض میں مبتلا لوگوں کی خانقاہوں میں ہوتی تھی نہ جانے کہاں کہاں سے پریشان حال لوگ حضرت شاہ غلام علی علیہ الرحمہ کی خانقاہ میں آتے اور اپنے درد کا مداوا حاصل کرتے۔ حضرت شاہ رؤف احمد مجددی کا کہنا ہے کہ میں ایک دن آپ کی خانقاہ میں لگی بھیڑ کو

دیکھ یہ پتہ لگانے کی کوشش کرنے لگا کہ یہ خلق خدا کہاں سے آئی ہے 28 جمادی الاولیٰ 1231ھ کی تاریخ تھی اس خانقاہ میں جو لوگ حاضر باش تھے ان میں درج ذیل شہروں کے لوگ تھے۔

''سمرقند، بخارا، غزنی، تاشقند، حصار، قندھار، کابل، پشاور، کشمیر، ملتان، لاہور، سرہند، امروہہ، سنبھل، رام پور، بریلی، لکھنؤ، جائس، بہرائچ، گورکھپور، عظیم آباد، ڈھاکہ، حیدرآباد وغیرہ۔'' (شاہ رؤف احمد، دارالمعارف ص 102 ترکی 1977)

حضرت شاہ غلام علی کے خلفا کے ذریعہ سلسلہ مجددیہ ہندوستان میں خوب پھیلا ان کے مریدین اور مریدین کے مریدین کے ذریعہ اس سلسلے نے ہندوستان میں حیرت انگیز طور پر ترقی کی آپ کے خلیفہ حضرت شاہ رؤف احمد مجددی نے (1201ھ) (1266ھ) بھوپال میں حضرت مولانا شاہ بشارت اللہ بہرائچی (وصال 1254ھ) نے بہرائچ میں اور شیخ گل محمد نے بخارا میں سلسلہ مجددیہ کی خانقاہ قائم کی اور اس سلسلہ کے فیضان کو عام وتام کیا۔

بڑے صاحب کشف وکرامت بزرگ تھے ایک دن ایک خوبصورت ہندو بچہ آپ کی مجلس میں آیا سب اہل مجلس اس کی طرف دیکھنے لگے حضرت کی نظر عنایت جیسے ہی اس پر پڑی تو فوراً زنار توڑ کر وہ مسلمان ہوگیا۔ بڑے کمال کے آدمی تھے۔ سرسید لکھتے ہیں:

> ''میرا کیا مقدور ہے کہ آپ کے کمالات ظاہری اور مقامات باطنی کا حال لکھ سکوں کیوں کہ حالات آپ کے اس سے سوا ہیں جو بیان ہوسکیں اور مقامات اس سے بہت ہیں جو لکھنے میں آویں سبحان اللہ علم اور عمل اور فضل وکمال اور تجرید وتجرد اور حلم وکرم اور سخاوت اتم اور ایثار وانکسار آپ کی ذات پر ختم ہے۔ آپ کی صحبت سے اس قدر فیض حاصل ہوتا کہ بیٹھ کر اٹھنے کو جی نہ چاہتا۔'' (سرسید، آثار الصنادید باب چہارم ص 16 علی گڑھ 2007)

میاں احمد یار جو آپ کے بڑے ساتھیوں میں سے تھے بیان کرتے ہیں کہ میں تجارت کے لیے قافلہ کے ساتھ جا رہا تھا کہ میں نے راستہ میں جنگل میں دیکھا کہ حضرت تشریف لائے اور میری گاڑی کے قریب ہوکر فرمایا کہ گاڑی دوڑا کر قافلہ سے آگے لے جاؤ کیوں کہ اس قافلہ کو ڈاکو لوٹیں گے یہ کہہ کر آپ نظر سے غائب ہوگئے، میں گاڑی دوڑا کر آگے نکل گیا ڈاکوؤں نے قافلہ

لوٹ لیا اور میں بخیریت منزل پر پہنچ گیا۔ (ماہنامہ کنزالایمان فروری 2003)

حضرت شاہ غلام علی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس زمانہ میں لوگ اتنا کھالیتے ہیں کہ ان میں فرائض وسنن ادا کرنے کی سکت باقی نہیں رہتی۔ حضرت شاہ روؤف احمد مجددی فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت کی بارگاہ میں حاضر تھا صوفیائے کرام کی غذا کی بات چل رہی تھی تو آپ نے فرمایا:

''یکے رضائے نفس است ویکے حق نفس ورضائے نفس غذائے مکلف وملطف وبسیار خوردن است وحق نفس آن کہ چنداں خورد کہ توانائے فروض وسنن باقی ماندراقم گوید چناں کہ بزرگے گفتہ است

نہ چنداں بخور کز دہانت برآید نہ چنداں کہ از ضعف جانت برآید

(شاہ روؤف احمد، درالمعارف ص 15 ترکی 1977ء)

(لذیذ اور زیادہ غذا انسان نفس کی خواہش کے لیے کھتا ہے حق نفس یہ ہے کہ اتنی ہی غذا کھائی جائے جس سے فرائض وسنن ادا کرنے کی توانائی حاصل ہو اور نہ اتنی کم غذا کھائی جائے جس سے ضعف کی بنیاد پر جان ہی نکل جائے۔)

حضرت شاہ غلام علی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے خلفا ومریدین کی طویل فہرست ہے اور ان میں بیشتر بڑے باکمال اور صاحب حال تھے اور روحانیت کے اس کمال تک پہنچنے میں بندگان خدا اپنی پوری عمر داؤ پر لگادیتے ہیں ایسے ایک بزرگ جن کا نام محمد حسن عرب تھا حضرت کے قدیم اصحاب میں سے تھے، صائم الدہر تھے، روزانہ چالیس ہزار مرتبہ کلمہ طیبہ کا ذکر زبان مبارک سے فرماتے اور دس ہزار مرتبہ نفی واثبات کا ورد حبس نفس کے ساتھ دل میں کرتے اور ہزار بار سورۂ اخلاص ، درود واستغفار کا معمول روزانہ کا تھا، ان مشغولیت کے باوجود راتوں رات بیدار رہتے اور دن میں حضرت (غلام علی شاہ) کی خدمت میں گزارتے اللہ تعالیٰ نے انہیں قلب سلیم عطا کیا تھا، تین سال میں سلوک طریقہ احمدیہ کی تکمیل فرمائی اور خلافت سے سرفراز ہوکر اپنے وطن واپس ہوئے اور وہاں جاکر مرجع انام بن گئے۔ حضرت شاہ غلام علی ان کے بارے میں فرماتے ہیں:

''کہ درتمام عمر یک کس طالب خدا ومجاہدہ راہ مولیٰ نزد فقیر آمدہ وآں کس محمد حسن عرب بودہ ایں لفظ دروصف او کافیست'' (شاہ غلام علی مقامات مظہریہ ص 99 ترکی 1989ء)

(تمام عمر ایک شخص نے طلب حق ومجاہدہ وریاضت میں گزار دی تو اسے ایک فقیر کا قرب حاصل ہوا اور وہ محمد حسن عرب ہیں ان کی تعریف میں اتنا ہی کہنا کافی ہے۔)

حضرت مولانا شاہ محمد آفاق دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

حضرت شاہ محمد آفاق کی ولادت 1160ھ میں ہوئی۔ والد ماجد کا نام احسان اللہ علیہ الرحمہ اور دادا کا نام شیخ محمد اظہر تھا جنہیں اورنگ زیب عالمگیر نے نواب ظہیر الدین کا خطاب دیا تھا (واقعات دارالحکومت دہلی)۔ آپ شرافت حسبی ونسبی وفضائل علمی ظاہری وباطنی میں ممتاز تھے۔ شجرۂ نسب امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر منتہی ہوتا ہے۔ سلوک کی تکمیل سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ میں حضرت خواجہ ضیاء اللہ سے فرمائی اور اسی سلسلہ میں انہی سے بیعت وارشاد کے علاوہ اجازت وخلافت بھی حاصل کی اور اپنی شبانہ روز مجاہدہ کے باعث حضرت خواجہ ضیاء اللہ کے خلفا میں ممتاز ہوئے۔ حضرت خواجہ ضیاء اللہ کے ذریعہ سلسلہ مجددیہ کا فیضان بہت عام ہوا حضرت شاہ غلام علی حضرت خواجہ ضیاء اللہ کے بارے میں فرماتے ہیں:

> ''جس نے نسبت مجددی مجسم نہ دیکھی ہو حضرت خواجہ ضیاء اللہ کو دیکھے۔'' (ابوالحسن علی ندوی، تذکرہ حضرت فضل الرحمان گنج مرادآبادی ص 23 لکھنو 1377ھ)

جب حضرت خواجہ ضیاء اللہ کا وصال ہوگیا تو حضرت شاہ محمد آفاق ایک مدت تک حضرت خواجہ میر درد کی صحبت میں رہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت شاہ محمد آفاق کو قبول عام عطا فرمایا تھا۔ ہندو بیرون ہند میں لوگ آپ کے بڑے معتقد اور مداح تھے۔ حضرت مولانا فضل الرحمان گنج مرادآبادی آپ ہی کے خلیفہ ارشد تھے وہ اپنے شیخ کے بارے میں فرماتے ہیں:

> ''ہمارے حضرت دس ہزار مرتبہ درود شریف اور پچاس ہزار مرتبہ کلمہ طیبہ پڑھتے تھے اور روز دس پارے قرآن مجید کے تہجد میں پڑھنے کا معمول تھا اور کچھ نہیں معلوم ہوتا تھا۔ دس پارے اتنی دیر میں ہو جاتے تھے کہ انجان سمجھے کہ ایک پارہ پڑھا ہوگا اور پانچوں وقت صلوۃ التسبیح پڑھتے تھے مزاج میں نہایت تواضع ومسکنت تھی۔'' (تذکرہ حضرت فضل الرحمن گنج مرادآبادی ص 23)

آپ کی خانقاہ میں دور دراز ملکوں سے لوگ آتے اور اکتساب فیض کرتے حضرت شاہ غلام علی بھی اپنے بعض مریدوں کو بھی آپ کی خدمت میں بھیجا کرتے تھے۔ جب آپ صاد فرماتے اس وقت تکمیل پوری سمجھی جاتی۔ حضرت اشرف کو شاعری کا بہت شوق تھا لیکن وہ شاعر نہیں تھے ایک روز انہوں نے آپ کی بارگاہ میں دعا کے لیے عرض کیا آپ نے اپنی ٹوپی ان کے سر پر رکھ دی اسی روز سے وہ اچھے شاعر ہو گئے (دلی کے بائیس خواجہ ص 264)

اتباع سنت نبوی پر پوری طرح گامزن تھے نسبت باطنی آپ کی بہت قوی تھی سر سید لکھتے ہیں:

> ''آپ کے مکاشفہ، مجاہدہ اور زہد تمام عالم میں مشہور ہیں آپ ہی اس زمانہ کے بڑے ولی اللہ ہوں میں سے تھے۔ نسبت باطنی اس قدر قوی تھی کہ بڑے بڑے صاحب نسبت اس کے اٹھانے کی طاقت نہیں رکھتے تھے۔ مقامات فقیری بہت صاف تھے، نسبت الی اللہ بہت درست تھی، پیروی سنت رسول مقبول نہایت مدنظر رکھتے تھے، مسکینی اور شکستگی بدرجہ کمال حاصل تھی۔'' (آثار الصنادید باب چہارم ص 28 علی گڑھ 2007)

اکبر شاہ ثانی کے دور حکومت 7 / محرم الحرام روز چہار شنبہ 1251ھ / 1835ء کو وصال فرمایا اور روز پنجشنبہ کو دہلی میں روشن آرا روڈ پر جہاں آپ کا مزار ہے اس جگہ آپ کے دادا پیر حضرت خواجہ محمد زبیر کو غسل دیا گیا آپ نے اسی جگہ کو حضرت کی اولاد سے برکت کے لیے خرید لیا تھا اور وصیت فرمائی تھی کہ مجھ کو یہیں دفن کرنا وہیں تدفین عمل میں آئی۔ آج بھی آپ کا وہ مزار مقدس روشن آرا روڈ پر جے پور ٹرانسپورٹ کے پاس ہے۔ (محمد عاصم، رہنمائے مزارات ص 291 دہلی 2007)

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی ولادت سلسلہ نقشبندیہ کے مشہور بزرگ حضرت شاہ عبدالرحیم کے خانوادے میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے گھر 25 / رمضان المبارک 1259ھ کو ہوئی۔ تاریخی نام ''غلام حلیم'' رکھا گیا والد ماجد سے تعلیمی استفادہ کیا شیخ نور اللہ بڑھانوی، شیخ محمد امین کشمیری، محمد عاشق بن عبید اللہ پھلتی اور دوسرے اجلہ علمائے کرام سے تفسیر واحادیث کا درس لیا اور اس کی سماعت فرمائی۔ اس علمی خانوادے کے چشم و چراغ تھے جس کے

گھرانہ میں علم وراثت میں چلا آرہا تھا۔ سرسید لکھتے ہیں:

''علم ان کے خانوادہ میں بطناً بعد بطن اور صلباً بعد صلب اس طرح چلا آتا ہے جیسے سلطنت سلاطین تیموریہ کے خاندان میں۔'' (آثار الصنادید باب چہارم ص69 علی گڑھ 2007)

آپ طویل القامت، نحیف البدن، گندم گوں، کشادہ پیشانی، داڑھی گھنی تھی بڑے خوش نویس تھے۔ تیر اندازی اور شہ سواری کا بھی شوق تھا۔ آپ سے درس و استفادہ کرنے والوں کی ایک طویل فہرست ہے، آپ کے برادران شاہ عبدالقادر، شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالغنی کو آپ ہی سے شرف تلمذ تھا۔ آپ کے داماد عبدالحیٔ بن عبداللہ بڑھانوی مفتی الٰہی بخش کاندھلوی اور دیو بند اور بریلوی علماء کے منتہائے تدریس حدیث آپ ہی تھے۔ آپ کے ارشد تلامذہ کی طویل فہرست ہے ہندوستان میں حدیث کے سلسلے میں بیشتر علماء کے ان کی ذات گرامی پر منتہی ہوتے ہیں۔ سرسید لکھتے ہیں:

''علم حدیث وتفسیر بعد آپ کے ہندوستان سے مفقود ہو گیا علمائے تمامی ہندوستان کے خوشہ چین اسی سرگروہ علماء کے خرمن کمال کے ہیں اور جمیع کملا اس دیار کے چاشنی گرفتہ، اسی زبدہ ارباب حقیقت کے مانند فضل و افضال کے۔'' (آثار الصنادید باب چہارم 72)

آپ نے 15 سال ہی کی عمر میں مسند تدریس بچھائی جس سے بڑے بڑے فضلا اور عقلائے روزگار نے استفادہ کیا اپنے زمانے میں علماء و مشائخ کے مرجع تھے۔ ان کی شاگردی بڑے بڑے علماء کے لئے باعث فخر تھی۔ حضرت شاہ غلام علی مجددی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت شاہ ابوسعید دہلوی، حضرت شاہ احمد سعید دہلوی، حضرت مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی، حضرت مولانا بزرگ علی مارہروی، حضرت شاہ بشارت اللہ بہرائچی، حضرت شاہ پناہ عطا سلونوی نے آپ ہی سے سند احادیث حاصل کیں اور شہرت اور ناموری کے عروج پر پہنچے۔ آپ کی علمی عظمت کا ذکر کرتے ہوئے سرسید لکھتے ہیں:

''اعلم العلما، افضل الفضلا، اکمل الکملا، اعراف العرفا، فخر الاماجد، والا ماثل، رشک سلف، داغ خلف، افضل المحدثین، اشرف علماء ربانین، مولانا و بالفضل اولانا شاہ عبدالعزیز دہلوی قدس سرہ العزیز ذات فیض آنحضرت بابرکت کی جامع فنون کسبی و وہبی اور مجموعہ فیض ظاہری و باطنی تھی۔'' (آثار الصنادید باب چہارم ص69 علی گڑھ 2007)

آپ کا معمول تھا کہ روزانہ آپ کے نواسے حضرت مولانا شاہ محمد اسحاق بن افضل عمری جو آپ کے ادارہ میں قاری تھے ایک رکوع قرآن کریم کی تلاوت فرماتے اور آپ اس کی تفسیر فرماتے اس کے علاوہ ہر شنبہ کو ہفتہ واری قرآن کریم کا وعظ ہوتا جو مکمل قرآن کریم کی تفسیر پر مشتمل ہوتا آپ کے حلقۂ وعظ میں عوام وخواص میں سے بے شمار شائقین شریک ہوتے انداز بیان ایسا دلکش تھا کہ ہر مذہب وملت کا آدمی وعظ سے خوش خوش جاتا ان کی کوئی بات کسی پر گراں نہ گذرتی۔ آپ کے نوک قلم سے ایک معرکتہ الآرا تفسیر فتح العزیز کے نام سے منظر عام پر آئی جسے بستان التفاسیر اور تفسیر عزیزی سے بھی جانا جاتا ہے، جو کئی بڑی جلدوں میں تھی مگر اس کے بیشتر حصے ہنگامہ غدر میں ضائع ہو گئے صرف اول وآخر کی دو جلدیں بچیں جن کی طباعت ہو چکی ہے۔ ان دو جلدوں کا ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ یہ علمی کتابیں تحفہ اثنا عشریہ، بستان المحدثین، سر الشہادتین، عزیز الا قتباس فی فضائل الناس، میزان العقائد، ملفوظات شاہ عبد العزیز، تحقیق الرویا، عجالہ نافعہ آپ سے یادگار ہیں۔ (اردو دائرۂ معارف اسلامیہ جلد 11 ص 636 لاہور 1975)

> ''لوگ آپ سے علمی استفادہ کے لیے حاضر ہوتے شاعر وادیب ادبی استفادہ اور اپنا کلام دکھانے کے لئے اور محتاج وضرورت مند لوگ امرا سے سفارش کرانے اور آپ کی ممکن مدد حاصل کرنے کے لیے آتے کیوں کہ آپ کے اخلاق کریمانہ کی شہرت عام تھی اسی طرح مریض دوا وعلاج کے لئے حاضر ہوتے تھے۔ اہل جذب وسلوک آپ سے روحانی استفادہ کے لیے آپ کے پاس جاتے تھے۔ پردیسی علماء ومشائخ کو آپ اپنے یہاں ٹھہراتے اور ان کی حاجت روائی کرتے اگر آپ کے پاس کوئی ایسا شخص بیٹھتا جسے دینی مسائل میں کچھ اختلاف ہوتا تو آپ اپنی سحر بیانی سے آگ اور پانی اور متضاد چیزوں میں اتحاد پیدا کر دیتے اور وہ آپ سے متفق وہم خیال ہو کر جدا ہوتا۔'' (ابوالحسن علی ندوی، تاریخ دعوت وعزیمت جلد 5 ص 351 لکھنؤ 1984)

حضرت شاہ عبدالعزیز علم وفضل کی جس بلندی پر فائز تھے سطور بالا کی روشنی میں بخوبی اس کا اندازہ لگایا

جا سکتا ہے اور سچ تو یہ ہے دنیائے علم وفن خاندان ولی اللّٰہی کو متعارف کرانے میں حضرت شاہ صاحب کا کلیدی کردار رہا ہے جس کا اعتراف اکثر مصنفین نے کیا ہے حیات ولی کے مصنف رحیم بخش لکھتے ہیں:

''جناب شاہ عبدالعزیز صاحب اپنے تمام بھائیوں میں سب سے افضل اور عمر میں سب سے بڑے ہیں اور اگر چہ جناب شاہ عبدالقادر صاحب اور جناب شاہ رفیع الدین صاحب اور شاہ عبدالغنی صاحب آپ کے تینوں بھائیوں نے گمنامی کے دائرے سے نکل کر عمدہ طریقہ پر تاریخی شہرت حاصل کی تھی اور علمی شہرت میں ہر ایک دوسرے سے بڑھ کر تھے، لیکن ان سب میں بلحاظ شہرت عام اور باعتبار لیاقت علمی قابل انتخاب شاہ عبدالعزیز صاحب ہی ہیں یہی وہ معزز اور دنیا کے نامور شخص ہیں جنہوں نے اپنے خاندان کو تمام دنیا میں روشناس کرایا حقیقت میں اگر اس جلیل القدر اور محترم خاندان میں جناب شاہ عبدالعزیز صاحب کا وجود مسعود نہ ہوتا تو یہ خاندان گمنامی کے دائرے سے کبھی نہیں نکلتا اور وہ تاریخی شہرت جو اسے آج حاصل ہے کبھی حاصل نہ ہوتی۔'' (رحیم بخش،حیات ولی ص338 دہلی 2008ء)

25 سال کی عمر آپ کو متعدد امراض نے گھیر لیا جن کے سبب برص اور جذام میں مبتلا ہو گئے اور بصارت بھی جاتی رہی 1248ھ میں وصال ہوا وقت زبان مبارک پر توفنی مسلما والحقنی بالصالحین جاری تھا۔ازدھام کے باعث آپ کی نماز جنازہ پچپن مرتبہ پڑھی گئی۔کسی نے اس طرح قطعہ تاریخ وصال لکھا ہے۔

حجت اللہ ناطق د گویا شاہ عبد العزیز فخرزمن
روز شنبہ وہفتم و شوال درمیان بہشت ساخت وطن
مہر نصف النہار در عرفاں مثل بدرمنیر در ہمہ فن
ازسر لطف وحلم تاریخش رضی اللہ عنہ گفت حسن

(آثار الصنادید باب چہارم 72 علی گڑھ 2007)

حضرت صوفی شاہ آبادانی سیال کوٹ ثم دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ:

حضرت صوفی شاہ آبادانی کی پیدائش سیال کوٹ پنجاب میں 1151ھ میں ہوئی۔ والد ماجد کا نام

شیخ نور جمال تھا۔ شجرۂ نسب حضرت سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر منتہی ہوتا ہے۔ آپ بزرگ خاندان کے فرد تھے، اہل شہر آپ کے خاندان والوں کو "میاں" صاحب کہتے تھے۔ اسی وجہ سے لوگ آپ کو میاں "آبادانی" کہہ کر پکارنے لگے۔ آپ کا نام آبادانی کیوں پڑا اس کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے مثنوی منیر اعظم (1311ھ) میں حضرت شاہ مولانا محمد کامل ولید پوری فرماتے ہیں۔

ہماں صوفی صافئ باکمال	بود موجد صوفیانہ رومال
آبادا نیش نام ایجادشد	کہ دہلی زویرانہ آبادشد
چوں ویراں شداز بدعت نادری	شد آباداز مولد قادری
بہ ملتاں ہمی بود پیر ہدیٰ	ہماں سیدِ حضرت زکریا
بحکمِ خدا وُبحکمِ نبی	بہ تعلیم نوشاہ امی ولی
زملتاں براہِ سفر تاختہ	بدہلی رسید و وطن ساختہ
پس از تربیت کردہ تعلیم را	عطا کردنور امانت بشاہ
بہ بخشید تاج وخلافت سریر	کہ شد ہفت اقلیم فرماں پذیر
بزدسکہ برقلبِ ہندوستاں	کہ ہندوستاں گشت جنت نشاں

(مثنوی منیر اعظم ص43,44)

(وہی صوفی صافی (حضرت شاہ آبادانی) جو صوفیانہ رومال (نیلگوں) کے ایجاد کرنے والے ہیں۔ ان کی برکت سے دہلی شہر ویرانہ پن سے آباد ہوا۔ اس لئے ان کا نام آبادانی پڑا۔ جب دہلی شہر نادر شاہ درانی کے ظلم وستم سے ویران ہوا تو حضرت شاہ آبادانی قادری کی برکت سے آباد ہوا۔ آپ کے پیرومرشد ملتان میں رہتے تھے وہ خدا اور نبی کے حکم سے نوشاہ مادرزاد ولی حضرت شاہ آبادانی کی تعلیم وتربیت کے لئے دہلی تشریف لائے اور پھر یہیں رہ گئے۔ انہوں نے تعلیم وتربیت دے کر خلافت کا تخت وتاج بخشا تا کہ ہفت اقلیم آپ کے زیرنگیں ہوجائیں۔ ان کا سکہ قلب ہندوستان دہلی کی سرزمین پر چلا جس کے باعث ہندوستان جنت نشان بن کر مشہور ہوا۔)

آپ کے پیر مرشد حضرت محمد زکریا حسنات و برکات کے جامع تھے علماء و فضلا اور اولیاء و صالحین کے حلقہ میں آپ کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ حضرت شاہ آبادانی کی آپ نے جس طرح تربیت فرمائی کہ وہ جلد ہی عوام و خواص میں مقبول ہو گئے۔ عشق الٰہی میں آپ کو بلند مقام ملا جس کے باعث عاشق الٰہی سے بھی مشہور ہوئے۔ آپ کی نظر کیمیا اثر سے بہت لوگوں کو ہدایت ملی۔ عہد غالب جس میں حضرت شاہ صوفی آبادانی تھے اسی دور میں ساتھ ہی ساتھ حضرت مرزا مظہر جان جاناں شہید، حضرت خواجہ میر درد، حضرت مولانا فخر الدین جہاں چشتی، حضرت سید غلام شاہ سادات چشتی، حضرت شاہ نانون چشتی، حضرت مولانا عبدالرحمان نقش بندی، حضرت شاہ رحیم بخش عرف مسعود نقش بندی اور مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی جیسے اہم بڑے بڑے عظیم و مرتب علمائے کرام و مشائخ عظام تھے بائیس خواجگان دہلی کی چوکھٹ کو رونق بخش رہے تھے۔ جن کی خانقاہوں سے رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری تھا۔ اسی دور میں کچھ شر پسند عناصر جیسے سیرت علی بیگ، جہانگیر بیگ اور لالہ بیگ دہلی میں شر و فساد پھیلا رہے تھے ان میں اس شر و فتنہ سے خلق خدا پریشان تھی یہ لوگ محلہ مغل پورہ میں رہتے تھے یہ محلّہ اب آریہ پورہ کے نام سے مشہور ہے جو پرانی سبزی منڈی روشن آرا کے پاس ہے۔ اکثر لوگ آپ کے خانقاہ میں آپ کی آزمائش اور شر پھیلانے کی نیت سے آتے۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے، ایک مرید نے گوہر آرا باغ مغل پورہ میں دعوت کی آپ چند مریدین کے ساتھ تشریف لے گئے مغل پورہ کے مغل بچے جو شر و فساد پھیلانے میں مشہور زمانہ تھے اسلحہ سے لیس ہو کر آپ کا امتحان لینے کی غرض سے آپ کے پاس آئے حضرت نے انتہائی متانت کے ساتھ آنے کا سبب دریافت کیا ان شر پسندوں نے آپ کی زیارت کا بہانہ بنایا۔ مگر حضرت نور باطن سے ان شر پسندوں کے اداروں کو بھانپ لیا اور میاں شیخ انور سے کہا کہ کوئی غزل سناؤ شیخ انور نے یہ غزل پڑھنی شروع کی۔

نرگس اندر باغ حیراں از نگاہ چشم تو　　مست آہو در بیاباں از نگاہ چشم تو

تو یاران طریقت وجد کرتے جھومنے لگے اور یہ شر پسند بچے آپس میں چہ میگوئیاں کرنے لگے جس پر بھی حضرت اپنی نظر کیمیا اثر ڈال دیتے ہیں وہ جھومنے لگتا ہے اگر حضرت ہم پر توجہ فرماتے ہیں

اور ہم پر اثر ہوتا ہے تو ٹھیک ہے ورنہ ہم یہاں ہنگامہ برپا کردیں گے حضرت نے ان شرپسندوں کے ارادوں کو تاڑ لیا اور ان پر ایسی توجہ فرمائی کہ وہ بھی وجد میں آکر رقص کرنے لگے۔ ہوش وحواس کھو بیٹھے سارا اسلحہ نکال کر باہر پھینک دیا نیم بسمل کی طرح تڑپ کر زمین پر گرنے لگے۔ ان کی حالت مردہ جیسی ہوگئی جب شور وغوغا بلند ہوا اور نالہ آسمان تک پہنچا آپ نے فرمایا انہیں میرے سامنے لاؤ، ان کے جسم کو کھینچ کر آپ کے سامنے پیش کیا گیا، آپ نے پانی پر دم کرکے ان کے بدن پر چھڑکاؤ کیا جس سے ان کے بدن کی کھوئی ہوئی طاقت بدن میں عود کر آئی آپ کے ہاتھوں پر توبہ کیا اور داخل سلسلہ ہوگئے اور شر وفساد کا جو بازار ان کے خاندان کی وجہ سے ہمیشہ گرم رہتا تھا اس سے دہلی والوں کو نجات مل گئی۔ اس طرح حضرت شاہ آبادانی کے بے شمار کمالات طریقت ہیں جن کی تفصیل کا یہ مختصر مقالہ متحمل نہیں۔

آپ کا وصال 69 سال کی عمر میں 1220ھ میں ہوا مزار مبارک زیر لال قلعہ پرانی پن چکیوں کے قریب ہے۔ یادگار دہلی کے مصنف کے بقول اس مزار مبارک کے قریب جانبِ غرب ایک گرجا گھر رومن کیتھولک کا ہے۔ آپ کے خلیفہ اول حضرت نواب سید امجد علی خاں رضوی نے ''نور القلوب'' میں یہ تاریخ ارتحال درج کی ہے۔

شہ آبادانی بس درویش بود ازہمہ شیخ زمانہ بیش بود

چوں کہ رحلت کرد از دار فنا ازغمش عالم ہمہ دل ریش بود

چونکہ پرسیدم زہاتف سال او گفت بامن ''پیر عہد خویش بود''

(ماخوذ از تذکرہ آبادانیہ سہیل فریدی دہلی 1994)

حضرت سید شاہ بڑے رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

آپ کا نام سید شاہ محمد سلیم قادری ہے۔ سید شاہ بڑے سے شہرت حاصل کی۔ غوث اعظم سیدنا شاہ عبدالقادر جیلانی علیہ الرحمۃ والرضوان سے خاندانی رشتہ ہے محمد شاہ بادشاہ کے عہد حکومت میں دہلی تشریف لائے۔ بادشاہ کا اصول یہ تھا کہ جو فقیر آپ کے عہد حکومت میں دہلی آتا اور اپنی فقیری وولایت کا دعویٰ کرتا تو بادشاہ پہلے اس کی فقیر کا امتحان لیتا اور آزمائش کے طور پر پہلے انہیں ایک

بندی خانہ میں رکھتا جہاں اس کے فقری کی آزمائش ہوتی اگر ان کی فقیری ثابت ہو جاتی تو بادشاہ انہیں بڑے اعزاز واکرام سے نوازتا جب حضرت سید شاہ بڑے رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ دہلی پہنچے تو ان کے فقر کا بڑا شہرہ ہوا جب یہ خبر کوتوال کو ہوئی تو کوتوال کے حکم سے کوتوالی کے پیادوں نے انہیں گھیر لیا اور آپ سے کہنے لگے کہ بھاگ جاؤ ورنہ پکڑے جاؤ گے اور بندی خانہ میں ڈال دیے جاؤ گے یہ سن کر آپ نے فرمایا کہ میں نے کیا جرم کیا ہے؟ اس تو تو، میں میں اور بھی کئی ایک پیادے آ پہنچے اور آتے ہی انہوں نے آپ کو اپنی گرفت میں لے لیا اور لے جا کر بندی خانہ میں بند کر دیا۔ بندی خانہ کے داروغہ نے آپ سے کہا:

"یہ چکی موجود ہے تم دانہ دلو آپ نے چکی کی طرف دیکھا تو چکی خود بخود چلنے لگی" (تذکرہ اولیائے ہند جلد 3 ص 86)

یہ منظر دیکھ کر بندی خانہ کے تمام خدام حیران رہ گئے اور بندی خانہ میں جو فقرا تھے وہ تمام بعجز وانکساری آپ کی خدمت میں یہ حاضر ہو کر کہنے لگے کہ ہماری بندی بھی چھڑائیے آپ نے بکمال شفقت بندی خانہ کے فقرا کی پریشانیوں کو دور کرتے ہوئے چکیوں سے فرمایا:

"اے، چکیو بحکم خدا دانہ دلو، فقرا کو تکلیف نہ دو اسی وقت سب چکیاں چلنے لگیں خود ہی دانہ اس میں پڑنے لگا۔"

اس تعجب خیز معاملہ کی اطلاع جب بندی خانہ کے داروغہ کو ہوئی تو وہ بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور بندی خانہ کے اندر ہونے والے تمام واقعات کی اس نے با شاہ کو خبر دی اس خبر سے بادشاہ بہت خوش ہوا اور اس کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا وہ خوشی خوشی بندی خانہ میں آیا اور آتے ہی آپ کے قدموں میں سر رکھ کر عرض کرنے لگا:

"تکلیف دینے کا سبب یہی تھا درویش کامل ملے خدا نے میری مراد پوری کی" (تذکرہ اولیائے ہند جلد 3 ص 82)

بادشاہ نے بندی خانہ کے تمام فقرا کو نقدی وتحائف دے کر رخصت کیا اور آپ کو بڑے اعزاز واکرام کے ساتھ اپنے ہمراہ شاہی محل میں لایا ایک عمدہ مکان میں رہائش کا بندوبست کیا۔ جب

چند دنوں وہاں رہتے ہوئے ہوگئے تو بادشاہ نے ازراہ عجز وانکساری فرمایا کہ میری التجا ہے کہ آپ دہلی ہی میں قیام فرمائیں اور جہاں آپ کا حکم ہو وہیں خانقاہ کی تعمیر کروادیں حضرت شاہ بڑے علیہ الرحمہ بادشا کی اس التجا کا چہ جائے کہ کوئی جواب دیتے فرمانے لگے:

''چار کوڑی خشت منگا اور ہم تم دونوں دریا کی سیر کریں الغرض دونوں کشتی پر سوار ہوئے جب کشتی بیچ دریا میں پہنچی تو حضرت نے وہ خشت دریا میں چھوڑ کر فرمایا کہ جہاں یہ ٹھہریں وہیں تکیہ فقیر کا ہوگا۔'' (تذکرہ اولیائے ہند جلد 3 ص 86)

بادشاہ نے ان اینٹوں کی تلاش کروائی جب پانی ہٹ گیا تو وہ اینٹ تھوڑے تھوڑے فرق سے موجود پائے گئے، حضرت شاہ بڑے رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کشتی سے اتر کر جہاں اینٹ پڑی تھی وہیں جا بیٹھے اور اسی کو اپنا مستقر بنا کر خلق خدا کی خدمت کا فریضہ انجام دینے لگے، ہمیشہ وہاں عوام وخواص کی بھیڑ لگی رہتی، تل دھرنے کی جگہ نہ رہتی اس جگہ کو اپنا مستقر بنانے کے بعد کبھی جمنا کا پانی پھر وہاں نہیں پہونچا۔ رہنمائے مقامات مقدس کے مصنف لکھتے ہیں:

1271ھ/1854ء میں وصال ہوا مزار مبارک دریائے جمنا کے کنارے راج گھاٹ کے بالکل سامنے واقع ہے دریا خواہ کس قدر طغیانی پر ہووے لیکن آپ کا مزار کبھی غرق نہیں ہوتا۔'' (رہنمائے مقامات مقدس دہلی ص 15)

حضرت اخوند حافظ العزیز دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

حضرت اخوند عبد حافظ العزیز کا لقب مقبول احمد قادری ہے اخوند برہان الدین سے قرآن مقدس حفظ کیا، دینی علوم کی تعلیم حضرت مولانا عبد القادر، حضرت مولانا محمد کرم اللہ دہلوی، حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اور حضرت مولانا محمد اسحاق سے حاصل کی اور علم وفضل میں اپنی مثال آپ ہوئے (غلام یحییٰ انجم، تاریخ مشائخ قادریہ جلد 3 ص 301 دہلی 2006ء)

اخوند حافظ عبد العزیز کا روحانی سلسلہ حضرت سیدنا شیخ محی الدین عبد القادر جیلانی پر منتہی ہوتا ہے۔ سلسلہ قادریہ میں آپ حضرت سیدنا شاہ محمد غوث قادری کے خلیفہ تھے جنہیں اس سلسلہ میں حضرت سید شاہ آل احمد مارہروی علیہ الرحمہ (پیرومرشد امام اہل سنت حضرت مولانا شاہ احمد رضا

خاں قادری علیہ الرحمۃ والرضوان) سے بیعت وارادت حاصل تھی اس طرح یہ سلسلہ خیر و برکت بزرگان مارہرہ مقدسہ کے توسط سے حضرت سیدنا شاہ عبدالرزاق بغدادی کا فیضان کرم حاصل کرتے ہوئے بانی سلسلہ قادریہ سے جاملتا ہے۔

اخوند حافظ عبدالعزیز علوم شریعت اور علوم طریقت دونوں کے سنگم تھے، عبادت وریاضت اور سخت مجاہدہ نفس کے سبب بارگاہ الٰہی کے مقربین میں محسوب ہوئے، بافیض بزرگ تھے، بے شمار بندگان خدا آپ کے چشمۂ صافی سے اپنی تشنگی بجھائی۔ آپ چلتی پھرتی خانقاہ تھے، جہاں پہنچتے وہیں عقیدت مندوں کی بھیڑ جمع ہوجاتی اور ان کی حاجت روائی میں مصروف ہوجاتے۔ شہر دہلی میں فراشخانہ کی کھڑکی کے سامنے ایک مسجد تھی جس میں آپ کی رہائش تھی صبح ہوتے ہی حاجت مندوں کی بھیڑ آپ کے در دولت پر یایوں کہئے کہ آپ کی خانقاہ میں جمع ہوجاتی اور آپ ان کی پریشانیوں کو دور کرنے میں لگ جاتے اور یہ سلسلہ روز وشب کے اکثر لمحات میں جاری رہتا۔ تذکرہ اولیائے ہند کے مصنف مرزا احمد اختر خلف اکبر محمد دارا بخت میراں شاہ دہلوی آپ کی مقبولیت سے متعلق اپنا ایک چشم دید واقعہ اپنی کتاب میں اس طرح درج کرتے ہیں۔

> ''ایک روز میرے پیر بھائی مرزا بہادر صاحب جو فرید عصر تھے مجھ کو ہمراہ لے کر حضرت کی خدمت میں آئے اس وقت حضرت مریضوں اور حاجت مندوں کی طرف متوجہ تھے کامل دس بجے جب فارغ ہوئے تو مرزا صاحب مذکورہ سے فرمایا کہ آج خلاف عادت اتنی دیر ٹھہرنے کا باعث کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ آج میں ایک کار ضروری کو آیا ہوں اور وہ یہ کہ مقروض ہوگیا ہوں میرا قرض ادا کیجیے آپ نے فرمایا کہ میں فقیر متوکل ہوں میرے پاس کیا ہے تم کو اللہ نے شہزادہ کیا ہے تم ہی کچھ اس کی سبیل نکالو مرزا صاحب نے کہا ہماری آپ کی پرانی دوستی ہے، کبھی کوئی کام نہیں پڑا آج ذرا سا کام پڑا سو ہی آپ گریز کرتے ہیں۔ اگر آج میرا کام نہ ہوا تو پھر میں کبھی نہیں ملوں گا۔'' (مرزا احمد اختر تذکرہ اولیائے ہند جلد 3 ص 88 دہلی)

اتنا سننے کے بعد اخوند حافظ عبدالعزیز پر ایک کیفیت طاری ہوگئی اور ان کو لے کر اپنے حجرہ کے بالا خانہ پر تشریف لے گئے اور اس مقام پر ٹھہرے جہاں آپ کی عبادت گاہ تھی اور اس کے بعد نیچے تشریف

لائے اور اجازت طلب کر کے مرزا صاحب اپنے گھر کے لئے روانہ ہوئے تو راستے میں مرزا احمد اختر کہنے لگے کہ آپ جب اوپر گئے پھر آپ دونوں حضرات نیچے تشریف لائے کیا ہوا حضرت نے کچھ دیا کہ نہیں اس کے جواب میں مرزا بہادر صاحب جو مومنانہ جملہ فرمایا وہ سننے کے قابل ہے فرماتے ہیں:

"بھائی مجھ کو اپنے حجرہ میں لے جا کر جلال میں آگئے اور فرمایا کہ کیا کہتا ہے میں نے کہا کچھ دیجئے یہ سن کر ایک دو ہنٹر چھت پر ماری میں نے دیکھا کہ چاروں طرف چھت گیری میں سے روپے کی دھاریں بندھ گئیں وہ روپیہ اس قدر تھا کہ اگر چھت مکان کی بیٹھ جاتی تو کچھ عجب نہ تھا اور مجھے سے فرمایا کہ اپنا روپیہ بھر لے جا۔" (مرزا احمد اختر تذکرۂ اولیا ہند جلد 3 ص 88 دہلی)

اس واقعہ سے حافظ اخوند عبد العزیز کی روحانی عظمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے سچ کہا ہے ڈاکٹر اقبال نے۔

نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

ملکہ وکٹوریہ قیصر ہند وانگلستان کے عہد حکومت میں بروز دوشنبہ 10 محرم الحرام 1296ھ /1878 کو وصال فرمایا اور حضرت خواجہ باقی باللہ علیہ الرحمۃ والرضوان کے احاطے میں اندر سرہانے کی جانب ایک چھوٹی سی علاحدہ چہار دیواری میں تدفین عمل میں آئی۔ (سید عبد العزیز آثار ص 75 دہلی 1911ء)

حضرت مولانا غلام قطب الدین رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

آپ مولانا فخر الدین (وصال 1784ء) علیہ الرحمہ کے فرزند ارجمند ہیں آپ کی ولادت دکن میں ہوئی، جب آپ کے والد ماجد دہلی تشریف لائے تو آپ کو اپنی ہمشیرہ کے سپرد کر دیا چند روز آپ بھی دہلی آگئے اور والد ماجد کے وصال کے بعد اپنے والد ماجد کے جانشین ہوئے ان کے بھی ایک فرزند تھے جن کا نام نصیر الدین تھا مگر میاں کالے سے مشہور تھے، دہلی گلی قاسم جان میں میاں کالے کی حویلی تھی جن میں کچھ دنوں مرزا غالب بھی اقامت پذیر تھے 18 رجنوری 1846ء کو میاں کالے کو وصال ہوا۔ مہرولی میں تدفین عمل میں آئی۔ (تذرعلی درد کاکوری، ملفوظات و

حالات شاہ فخر دہلوی 26 کراچی 1961)

حضرت غلام قطب الدین نے اپنے والد ماجد کے روحانی مشن اور ان کی خانقاہ کو اوج کمال عطا کیا سلطان محمد اکبر شاہ اور سلطان بہادر شاہ ظفر آپ ہی کے مرید تھے جس کا اعتراف انہوں نے اپنے ان اشعار میں کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

مرید قطب دیں ہوں خاک پائے فخر دیں ہوں میں　　اگر چہ شاہ ہوں، ان کا غلام کمتریں ہوں میں
انہی کے فیض سے ہے نام روشن میرا عالم میں　　وگرنہ یوں تو بالکل روسیہ مثل نگیں ہوں میں
یہی عقدہ کشا میرے یہی ہیں رہنما میرے　　سمجھتا ان کو اپنا حامی دنیا و دیں ہوں میں
بہادر شاہ میرا نام ہے مشہور عالم میں　　ولیکن اے ظفر ان کا گدائے رہ نشیں ہوں میں

(خلیق احمد نظامی تاریخ مشائخ چشت ص 516)

آپ کے والد ماجد حضرت شاہ محمد فخر الدین کے بارے میں سر سید نے تفصیل سے لکھنے کے بعد لکھا ہے کہ حضرت مولانا قطب الدین اپنے حضرت موصوف کے فرزند ارجمند ہیں اور حضرت کی وفات کے بعد مسند خلافت پر متمکن ہوئے آپ کی تعریف وتوصیف لکھنے کی کچھ حاجت نہیں یہی کافی ہے کہ ایسے چمن کے نونہال اور نہال کے ثمر تھے۔

اصل وفرعی را کہ بینی حاصل یکمایہ اند　　آفتاب و پرتوش از ہم جدا نتواں گرفت

(آثار الصنادید باب چہارم ص 33 علی گڑھ 2007ء)

حضرت شاہ مسعود محدث دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

دہلی کے اعلیٰ درجہ کے محدث اور مفتی ہونے کے ساتھ ساتھ عارف باللہ اور عابد شب زندہ دار تھے۔ آپ کی ذات بابرکت مسلمانان ہند بطور خاص اہل دہلی کے لئے مینارۂ ہدایت تھی۔ اصل نام تو رحیم بخش تھا لیکن اپنے لقب شاہ مسعود سے مشہور ہوئے۔ سلسلہ نسب حضرت جلال الدین جعفر تھانیسری (وصال بعمر 92 سال 989ھ) سے ہوتے ہوئے حضرت امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر منتہی ہوتا ہے۔ ولادت 1834ء میں آبائی مکان بازار سرکی والان دہلی میں ہوئی، 1856 میں تحصیل علم سے فارغ ہوئے۔ طلب معاش کے تعلق سے پنجاب کا سفر کیا، وہیں قطب پنجاب عارف کامل

حضرت سید امام علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت وارادت کا شرف حاصل کیا۔

حضرت شاہ مسعود اپنے پیرومرشد کے حکم سے دہلی واپس آئے، جامع مسجد فتح پوری میں خانقاہ مسعودیہ کی بنیاد ڈالی اور وہیں سے روحانی فیوض وبرکات کا سلسلہ جاری ہوا، خلق خدا نے آپ سے بہت استفادہ کیا۔ حاجت مندوں کی آپ خانقاہ میں ہمیشہ بھیڑ رہتی، پریشان حال پر آپ اپنی توجہ فرماتے وہ شفا پاکر اپنے گھر واپس جاتے، رشد وہدایت کے علاوہ آپ نے بندگان حق کی رشد وہدایت کے لیے قلم کا بھی سہارا لیا اور آپ کے نوک قلم سے نور العرفان، فیوض محمدی، الدرۃ الیتیم فی القرآن العظیم، دار ثمانیه، مکتوب مسعودی، رساله وجدیه اور رساله سماع موتی جیسی اہم کتابیں منظر عام پر آئیں۔

1892 میں وصال ہوا مزار مقدس حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی مسجد سے شمال جانب ایک احاطے میں ہے۔ (رہنمائے مزارات دہلی ص 276)

حضرت خواجہ میر درد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

حضرت خواجہ میر درد کے مورث اعلیٰ خواجہ محمد طاہر نقشبندی عہد اورنگ زیب میں بخارا سے چل کر دہلی آئے۔ دادا کا نام نواب ظفر اللہ خاں تھا۔ درد کی ولادت خواجہ ناصر کے گھر 1133ھ میں ہوئی نجیب الطرفین سید تھے، والد ماجد کی طرف سلسلہ نسب حضرت بہاوالدین نقشبندی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اور والدہ ماجدہ کی طرف سے حضرت سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی علیہ الرحمۃ والرضوان سے جاملتا ہے۔

ظاہری وباطنی علوم میں اپنے والد ماجد سے کمال حاصل کیا، مفتی دولت اور سراج الدین خاں آرزو بھی آپ کے اساتذہ میں تھے۔ فن موسیقی سے آپ کو بھی گہری دلچسپی تھی۔ شعروسخن کا ذوق ورثہ میں ملا تھا والد ماجد خواجہ ناصر (وصال 1172ھ) فارسی کے نعت گو شاعر تھے عندلیب تخلص فرماتے تھے۔

حضرت خواجہ میر درد کو سلسلہ قادریہ سے نسبت ضرور تھی مگر آپ کا رجحان سلسلہ نقشبندیہ کی طرف زیادہ تھا، اس سلسلے کے دو بزرگ حضرت شاہ سعد اللہ گلشن اور حضرت خواجہ محمد زبیر علیہم الرحمۃ الرضوان سے آپ کو زبردست ارادت تھی۔ اردو زبان کے بہترین شاعر تھے ہی آپ نے اپنی شاعری میں جس طرح تصوف کے مضامین باندھے ہیں وہ آپ ہی کا حصہ ہے۔ فارسی اور اردو کے معروف ومشہور شعرا

دادا کے علاوہ جن عظیم خدا رسید مشائخ کی آپ کو ہم نشینی حاصل تھی ان میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی، حضرت شاہ عبد القادر محدث دہلوی، حضرت عبد الرحیم حضرت مولانا فخر جہاں، حضرت فخر الدین چشتی نظامی، حضرت شاہ محمد آفاق نقشبندی، حضرت مرزا مظہر جان جاناں اور حضرت بھولو شاہ مجذوب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ قابل ذکر ہیں۔

والد ماجد کے وصال کے بعد حضرت خواجہ میر درد نے والد ماجد کی جانشینی کا اہم فریضہ احسن طور پر انجام دیا والد ماجد سے زہد و تقویٰ، باطنی قوت، روشن ضمیری اور حق پرستی کی عادت جو وراثت میں ملی تھی زندگی بھر اسی پر تکیہ کئے رہے۔ اپنے عہد کے چلن کے خلاف خواجہ میر درد نے کبھی کسی بادشاہ کا قصیدہ یا ہجو لکھ کر اپنی زبان آلودہ کرنا پسند نہ فرمائی۔ ان کے استغنا کے تعلق سے محمد حسین آزاد کا یہ تبصرہ انتہائی معنی خیز ہے۔

''اگلے وقتوں کے لوگ خوش اعتقاد بہت ہوتے تھے اسی واسطے جو اللہ کے نام توکل کر کے بیٹھے رہتے تھے ان کی سب سے اچھی گذر جاتی تھی یہی سبب ہے کہ خواجہ صاحب کو نوکری یا دہلی سے باہر جانے کی ضرورت نہ ہوئی۔'' (آب حیات، محمد حسین آزاد ص 140)

خواجہ میر درد اگر چہ نقشبندیہ سلسلے سے تعلق رکھتے تھے جس میں سماع ممنوع ہے وہ نہ انکار کنیم ونہ ریں کار کنیم پر عمل پیرا ہوتے ہیں مگر اس کے باوجود خواجہ میر درد موسیقی میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ اپنے حجرے میں اکثر اس فن کا مظاہرہ کرنا اور سننا معیوب نہ تصور کرتے تھے۔ خواجہ میر درد کے اس ذہنی فکری رویے کی داد دیتے ہوئے وحید اختر لکھتے ہیں۔

''اس عقیدے اور کیفیت کے پیش نظر درد ایسے صاحب درد کا سماع سے اثر لینا اور شاعرانہ مزاج رکھتے ہوئے اس کیفیت کو قبول کرنا ان کی دردمندی اور خوش ذوقی پر دلالت کرتا ہے۔'' (خواجہ میر درد تصوف اور شاعری ص 35)

خواجہ میر درد کی متصوفانہ شاعری کے مطالعہ سے ایک قاری کا ان کے تصوف سے والہانہ لگاؤ کا جو پتا چلتا ہے اس کی طرف اشارہ قاضی عبدالرحمان ہاشمی نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

''ہندوستان کے صوفیاء میں درد واحد صوفی ہیں جنہوں نے شیخ مجدد الف ثانی کے بعد

ایک مکمل نظام تصوف واخلاق پیش کیا اور ان کے اس دعوی کی روشنی میں یہ کہنا صحیح ہوگا جہاں پہنچ کر مجدد صاحب کے قدم رک گئے تھے درد نے ان مقامات کو بھی آسان کر دیا۔'' (خواجہ میر درد ص 130 اردو اکیڈمی دہلی 2008)

خواجہ میر درد یقیناً ایک صوفی شاعر تھے ان کے اذہان وافکار عقیدت کی طہارت سے آراستہ ہوکر منزل جاناں کے طواف میں ہمیشہ سرگرم عمل رہتے تھے اسی لئے ان کے جو اشعار الفاظ کے جامہ پہنتے یا فکر کے سانچے میں ڈھلتے ان کی افادیت وقتی نہیں دائمی ہوتی تھی۔ درد اپنی وجدانی شاعری کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''میری زبان سے وہ اسرار نہانی کا ظہور پیدا ہوتا ہے وہ شمع عرفانی ہے جس نے بزم جہاں کو روشن کر رکھا ہے بظاہر میری سوختہ جانی اور گداختہ دلی مجھ سے منسوب ہے لیکن حقیقت میں یہ رازہائے پنہانی نور رحمانی سے مشتعل ہوکر پردۂ شہود پر آتے ہیں۔'' (شمع محفل خواجہ میر درد ص 256)

درد کی شاعری میں تصوف کے موضوعات صرف ''تصوف برائے شعر گفتن خوب است'' کی حد تک نہیں تھے بلکہ وہ پوری ان کی زندگی میں رچے بسے تھے جیسے وہ تصوف کے ان اصولوں مثلاً حب الٰہی، تواضع، انکساری، محبت، توکل، عدل وانصاف، خلق حسن، حسن سلوک، شیریں گفتاری، اطعام مساکین، صبر وشکر، سخاوت واستقامت، زہد وریاضت، اطاعت وفرمانبرداری، خوف خدا، طہارت و پاکیزگی، عفت و پاکدامنی، تفکر وتدبیر، زکر وفکر، توبہ و استغفار، راست بازی وعبرت پذیری پر مکمل طور پر گامزن تھے ان کی شاعری میں ایسے عناصر کا پایا جانا ضروری تھا جن کا تعلق براہ راست مباحث تصوف سے تھا۔ بقول وحید اختر

''درد پہلے شاعر ہیں جنہوں نے اردو غزل کو تصوف کے میدان میں فارسی شعرا کے برابر کھڑا ہونے کے لائق بنایا۔'' (خواجہ میر درد تصوف اور شاعری ص 378 علی گڑھ)

خواجہ میر درد کی متصوفانہ شاعری کے کچھ نمونے بطور مثال ذیل میں دئے جا رہے ہیں۔

درد وہ گل بدن مگر، تجھ کو نظر پڑا کہیں آج تو اس قدر بتا کس لئے باغ باغ ہے

صورتوں میں خوب ہوں گی شیخ گو حور بہشت پر کہاں یہ شوخیاں، یہ طور یہ محبوبیاں

وحدت نے ہر طرف ترے جلوے دکھائے ہیں پردے تعینات کے جو تھے اٹھائے ہیں

ہوئے کب وحدت سے کثرت میں خلل جسم وجاں گو دو ہیں پر ہم ایک ہیں

آواز نہیں قید میں زنجیر کی ہرگز ہر چند کہ عالم میں ہوں عالم سے جدا ہوں

ارض وسما کہاں تری وسعت کو پا سکے میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے

خواجہ میر درد نے اپنے والد ماجد کی مسند رشد وہدایت پر بیٹھ کر خانقاہ میں صرف عبادت وریاضت اور رشد وہدایت کے فرائض ہی انجام نہیں دئے بلکہ شعروسخن میں نامور تلامذہ کی طویل فہرست تیار کی اور تصوف کے اہم موضوعات پر دلچسپ کتابیں بھی تصنیف فرمائیں جن کی تفصیل کچھ اس طرح ہے۔اسرار الصلوٰۃ، واردات قلب،علم الکتاب،نالۂ درد، آہ سرد، درد دل، شمع محفل، دیوان فارسی،دیوان اردو، حرف تمنا، واقعات درد، سوز دل، صحیفۂ واردات وغیرہ وغیرہ۔

66 سال کی عمر میں 1199ھ میں وصال ہوا مزار اقدس بستی خواجہ میر درد (شکور کی ڈنڈی) نئی دہلی 2 میں مسجد کے پیچھے ایک احاطے میں ہے۔(محمد عاصم، رہنمائے مزارات دہلی ص 343 دہلی 2007)

ان نفوس قدسیہ کے علاوہ حضرت شاہ سکندر شہید (1857) حضرت بغدادی شاہ (وصال 1889) حضرت شیخ نصیر الدین عرف کالے (وصال 1262ھ/1845ء) حضرت مولانا نظام الدین علیہ الرحمہ وصال 1292ھ/1875ء) حضرت شاہ صابر بخش (وصال 1237ھ) حضرت شاہ ابو سعید (وصال 1835ء) حضرت شاہ محمد سعید،حضرت شاہ عبد الغنی،حضرت حاجی علاء الدین، حضرت خواجہ محمد نصیر، حضرت شاہ غیاث الدین، حضرت میر مہدی، حضرت میاں شاہ نانو اور حضرت شاہ جلال علیہم الرحمۃ والرضوان قابل ذکر ہیں جن کی خانقاہیں عہد غالب میں رشد وہدایت کا مرکز اور حاجت مندوں کے لئے قلبی طمانیت وسکون کا سرچشمہ تھیں۔

✿✿✿

معید رشیدی

غالب اور مومن: مفروضات اور حقائق

اردو کی ادبی تاریخ میں غالب اور مومن مطالعات کا توجہ طلب، عبرت انگیز اور سب سے افسوس ناک رویہ وہ ہے جس میں غالب اور مومن کو ایک دوسرے کا حریف ٹھہرایا جاتا ہے۔ موازنے اور مقابلے کے بعد ایک کو کمتر اور دوسرے کو برتر ثابت کیا جاتا ہے۔ یہ پہلو بعض اوقات اس قدر شدت اختیار کر جاتا ہے کہ ایک کے سامنے دوسرے کا چراغ نہیں جل پاتا۔ 'آبِ حیات' اس واقعے کا سب سے پہلا مظہر ہے۔ محمد حسین آزاد نے جو ادبی فہرستِ استناد مرتب کی اس میں مومن خاں مومن انھیں اس وضع اور شان کے نظر نہیں آئے۔ جس معیار پر انھیں ذوق سب سے بڑے اور غالب انیسویں صدی کے سب سے اہم شاعر محسوس ہوئے۔ یوں تو شیفتہ نے گلشن بے خار میں مومن کی شخصیت کی مبالغہ آمیز تعریف کی اور یہی رویہ محمد حسین آزاد نے بھی اپنے استاد ذوق کے لیے روا رکھا، لیکن آج شیفتہ کی نظر سے مومن کو دیکھا جاتا ہے اور نہ آزاد کی نگاہ سے ذوق کو۔ اس کا سبب اور کچھ نہیں کہ آج کے قاری کے لیے ان دونوں شخصیات سے وابستگی کی سطح بنیادی طور پر تاریخی اور ادبی ہے۔ عقیدہ اور عقیدت، اقدار معاملات ہیں۔ اسی لیے انیسویں صدی کے شعری افق پر غالب، مومن اور ذوق کی جو تثلیث بنتی ہے، اس میں اکثر غالب کا نام پہلے آتا ہے، پھر مومن اور آخر میں ذوق کا نام لیا جاتا ہے۔ تقدیم وتاخیر میں فکر وفن کا امتزاج اقداری اصولوں کا پابند ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض ناقدین میں تقدیم وتاخیر کے سلسلے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ جب ہم شاعری پر گفتگو کرتے ہیں تو اکثر ہمارا محور غزل ہوتی ہے۔ اس طرح ذوق بحث کا حصہ نہیں بن پاتے اور تثلیث ٹوٹ جاتی ہے۔ اب رہے غالب اور مومن۔ جب یہاں سے گفتگو شروع ہوتی

ہے تو پہلے فیصلہ کرلیا جاتا ہے کہ بڑا کون ہے اور چھوٹا کون؟ اکثریت غالب کو بڑا شاعر سمجھتی ہے، لیکن کچھ لوگ مومن کے حق میں بھی نظر آتے ہیں۔ عرش گیاوی، ضیا احمد بدایونی اور نیاز فتح پوری مومن کو غالب سے بڑا شاعر قرار دیتے ہیں اور ان کے مطابق یہ دعویٰ سخن فہمی کی بنیاد پر ہے، نہ کہ طرف داری کی بنیاد پر۔

مومن خان مومن اردو کے منفرد شاعر ہیں۔ غزل کے کڑے انتخاب میں بھی انھیں جگہ مل جاتی ہے۔ پہلی بار انھوں نے ہی اردو غزل کو 'پردہ نشین' کے تصور سے روشناس کرایا۔ ان کی عشقیہ شاعری کی سب نے تعریف کی۔ قدرت نے انھیں علوم وفنون کی دولت سے مالا مال کیا تھا، لیکن کیا کیجیے کہ شاعری کو علمیت سے کہیں زیادہ بصیرت درکار ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ قطعی نہیں کہ ان کے یہاں علوم پر دسترس کی انا نے ان علوم کی فلسفیانہ اساس کو متاثر کیا اور زیادہ پھیلنے نہ دیا۔ ان کے بارے میں مشہور ہے کہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ انھوں نے اپنی گہری بصیرتوں سے اتنا کام نہیں لیا۔ جتنا غالب نے لیا۔ انھوں نے اپنے کلام پر توجہ نہ دی۔ اس لیے ان کے کلیات کے پہلے ایڈیشن میں اغلاط موجود ہیں۔ جتنے اغلاط ان کے یہاں تھے، کسی اور کے یہاں ہوتے تو اس کی زبان دانی اور استادی مشکوک ٹھہرتی، لیکن ان پر کوئی شک نہیں کرتا اور انھیں استاد تسلیم کرتا ہے۔ معنی آفرینی کی بحث ہو یا نازک خیالی کی، ان کا نام غالب کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ غالب نے خود ان کے بارے میں کہا کہ ان کی طبیعت معنی آفرین تھی اس لیے ان کے کلام کی بھی شرح کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے اور شرحیں لکھی بھی گئی ہیں۔ غالب کی طرح اگر وہ اپنے کلام پر غور وفکر کرتے تو صورت حال کچھ اور ہوتی۔ نہ اغلاط کا گزر ہوتا اور نہ اشکال کی شکایت ہوتی۔ غالب نے اپنے ابتدائی زمانے کا کلام قلم زد کردیا تھا اور ایسا انتخاب پیش کیا جس کی داد، دنیا دینے پر مجبور ہے۔ مومن نے اپنے کلام کا کوئی انتخاب نہیں کیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ غالب کو حالی مل گئے اور ذوق کو محمد حسین آزاد، لیکن مومن کو ایسا کوئی شاگرد نہیں جو ان کے کارناموں کو سلیقے اور قرینے سے دنیا کے سامنے پیش کرتا اور شرح وتعبیر کے ذریعے کلام کی تنقیدی حیثیت کو مستحکم بناتا۔ سچ تو یہ ہے کہ مومن کو بھی شیفتہ کی صورت میں ایک شاگرد نصیب ہوا۔ شیفتہ نے ان کا کلام جمع کرکے

ترتیب دیا جسے مولوی کریم الدین نے 1846 میں دہلی سے شائع کیا۔ مومن کی حیات میں ان کے کلیات کا یہ واحد ایڈیشن تھا۔ ان کی موت کے بعد اس کی اشاعت متعدد دفعہ ہوئی۔ آج کا کلام جس شکل میں بھی ہے شیفتہ کی کوششوں کا ثمرہ ہے۔ شیفتہ نے ان کی حیات اور کارناموں پر کوئی کتاب یا تفصیل نہیں لکھی۔ محمد حسین آزاد نے انھیں 'آب حیات' کے پہلے ایڈیشن میں شامل نہ کیا تو اس پر گرفت کی گئی، اس لئے کہ وہ مستحق تھے اور یہ ان کے ساتھ زیادتی تھی۔ حالی نے ان کے حالات فراہم کیے تو دوسرے ایڈیشن میں اس کا ازالہ ہوگیا۔

عام طور پر غالب کو مومن کا حریف بنا کر پیش کیا جاتا ہے، لیکن یہ غلط ہے، دونوں اچھے دوست تھے۔ دونوں میں رقابت کا کوئی جذبہ نہ تھا۔ دونوں اپنے زمانے کے استاد اور مستند شاعر تھے۔ غالب نے ان کی تعریف کی، مگر کیا کیا جائے، بعض اوقات مطالعے کی بنیاد ہی غلط پڑ جاتی ہے۔ مومن کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ غالب کے ناقدین نے لکھتے ہوئے پہلے ہی طے کرلیں کہ غالب کو بڑا دکھانے کے لیے مومن کو چھوٹا ثابت کیا جائے اور مومن کے ناقدین نے بھی یہی کیا کہ لکھتے وقت تہیہ کرلیا کہ مومن کو برتر بتانے کے لیے غالب کو کم تر دکھایا جائے۔ مطالعے کا یہ انداز کس کروٹ بیٹھے گا، دو چار صفحات کے بعد معلوم پڑ جاتا ہے اور کچھ بیزاری کا احساس ہونے لگتا ہے۔ دونوں کا مزاج الگ ہے۔ شاعرانہ تشخص الگ ہے۔ محرکات جدا ہیں اور سخن شناسوں کے لیے دونوں عزیز ہیں۔ بڑے چھوٹے کا فیصلہ کرنا وقت کا کام ہے۔ اس سے کون انکار کرے گا کہ مومن اردو کے اچھے اور منفرد شاعر ہیں۔ اس لیے ہمارا سروکار ان خوبیوں سے ہونا چاہیے جن کی وجہ سے وہ اچھے اور منفرد ہیں اردو غزل میں ان کی حیثیت تاریخی ہے اور اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہے۔

مومن مطالعات کا آغاز تذکروں سے ہوتا ہے اردو ادب کی جو تاریخیں لکھی گئیں، ان میں بھی مومن مطالعات کا سلسلہ قائم ہے۔ مومن پر کچھ مستقل کتابیں لکھی گئیں جن میں ان کے سوانح حیات پر خصوصی توجہ دی گئی۔ رسائل میں مومن پر مضامین چھپے اور کچھ رسائل نے مومن نمبر بھی شائع کیا۔ نیاز فتحپوری نے جنوری 1928 میں ''نگار'' کا مومن نمبر شائع کیا جو مومن مطالعات میں

سنگ میل ہے۔ یہ پہلی پرزور اور اجتماعی کوشش تھی جس نے مومن کی طرف توجہ دی اور اہل نظر کی توجہ کو مائل کیا۔ عرش گیاوی نے 'حیات مومن' لکھ کر حالاتِ زندگی کی کڑیاں ملائیں۔ ضیا احمد بدایونی نے پہلی بار غزلیات اور قصائد کی شرح لکھی۔ نیاز فتحپوری، ضیا احمد بدایونی، عرش گیاوی ان تینوں حضرات نے مومن کو غالب سے بڑا شاعر قرار دیا۔لیکن اس سے نہ غالب کا کچھ بگڑا اور نہ مومن کا کچھ بنا۔ اقبال نے مومن کو تسلیم نہیں کیا۔ اس لیے کہ مومن کا کلام ان کے مشن اور افکار سے مطابقت نہیں رکھتا تھا۔اقبال کو ضیا احمد بدایونی نے مجموعہ غزلیات بھیجا تھا۔ اقبال کی نظر سے مثنوی 'جہادیہ' نہیں گزری تھی۔ اگر یہ مثنوی ان کی نظر سے گزرتی تو ان کی رائے یقینی طور پر بدلتی۔ ظہیر احمد صدیقی نے مومن پر پی ایچ ڈی کا مقالہ تحریر کیا بعد میں اس نوع کے اور بھی مقالے اور کچھ اچھے مضامین لکھے گئے۔ فرہنگ کلام مومن تیار ہوا۔ مومن مطالعات نے بھی اتنا ہی سفر طے کیا ہے، جتنا غالب مطالعات نے کیا ہے،لیکن مومن مطالعات میں اتنے موڑ نہیں آئے۔ جتنے غالب مطالعات میں آئے ہیں۔

غالب اور مومن کے حوالے سے کچھ مفروضے راہ پا گئے ہیں اور آج بھی کسی نہ کسی صورت دہرائے جا رہے ہیں۔ اس ضمن میں سب سے زیادہ ان کی ذاتی زندگی کے واقعات اور ان کے متعلقات سے نتائج نکالنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ غالب کے انگریزوں سے جو معاملات تھے، ان کی بنیاد پر انھیں چاپلوس کہا جاتا رہا ہے۔ ضیا احمد بدایونی کا جملہ ہے کہ غالب عمر بھر حکام کی چاپلوسی کو طرۂ امتیاز سمجھتے رہے۔ اس کے مقابلے میں مومن کے بارے میں کہتے ہیں کہ ان کے یہاں ایسے خیالات کی کمی نہیں جو ان کے دردِ قوم وملت کے یقیناً آئینہ دار ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ غالب کے مقابلے مومن مذہبی تھے۔ ضیا صاحب کے مطابق آخر میں غالب نے رنگ میر اختیار کر لیا تھا اور مومن اپنے ذاتی طرز پر آگئے تھے۔ ان کے ہم عصروں میں ذوق و غالب دونوں 'مقلد' ہیں یعنی ایک کے کلام میں سودا، نصیر، مصحفی، انشا اور جرأت کا تتبع پایا جاتا ہے جبکہ دوسرے کے یہاں بیدل و میر کا۔ ایک مومن ہیں جن کو بقول ضیا احمد بدایونی مجتہد فن کہا جا سکتا ہے۔ ضیا احمد بدایونی کے خیالات نہ صرف تضاد کا شکار ہیں بلکہ ان کی تفہیم کے رویوں اور فیصلوں میں جانب داری کا

احساس ہوتا ہے۔ مومن نے اگر تمام اصناف میں طبع آزمائی کی تو یہ کوئی بہت بڑی بات نہیں۔ ایک سے زائد اصناف میں طبع آزمائی اس زمانے کا عام رجحان تھی اور محض طبع آزمائی سے کوئی بڑا شاعر نہیں بن جاتا اور کیا وجہ ہے کہ ''غزل ہی مومن کی معراج الکمال ہے اور اس کے بدولت وہ صاحب طرز مانے گئے''۔ مومن کو بڑا ثابت کرنے کے لیے غالب کو چھوٹا کہنا ضروری نہیں۔ غالب انگریزوں کے چاپلوس تھے۔ یہ مان بھی لیا جائے تو اس سے ان کی شاعری کا مرتبہ کم نہیں ہو جاتا، یا مومن کے مذہبی ہونے کے سبب ان کی شاعری بڑی نہیں ہو جاتی۔ شخصیت کے کسی ایک جز کو پوری شخصیت فرض کر لینا، انصاف نہیں۔ غالب کو مقلد اور مومن کو مجتہدِ فن کہنے میں جانب داری کی بو آتی ہے۔ مومن کو اہم اور بڑا ثابت کرنے کی کوشش میں سودا، غالب اور ذوق کو بیچ میں لانے کی ضرورت نہیں۔ سلیقے کی بات تو یہی ہے کہ جس طرح غالب اردو کے اہم شاعر ہیں، اسی طرح مومن بھی اہم اور صاحب طرز ہیں اور یہ بھی کسی فیشن، تعصب یا عقیدت میں کہی ہوئی بات نہیں۔

ضیا صاحب کہتے ہیں کہ فلسفہ اور تصوف میں غالب مومن سے برتر ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ غالب کی شاعری خشک فلسفہ بن کر رہ جاتی ہے۔ یعنی فلسفہ غالب کے کلام میں کسی مثبت معنی میں نہیں۔ اگر مثبت معنی میں ہوتا تو خشکی کی شکایت نہ ہوتی۔ ضیا صاحب لکھتے ہیں۔ ''رہے فلسفہ و تصوف۔ ان کو کوئی غزل کی حدود میں شامل جانے یا نہ جانے، مومن حدودِ غزل سے خارج مانتے ہیں۔'' یعنی اگر اقتباس کا سیاق دیکھا جائے تو وہ سیدھے طور پر یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مومن، غالب و ذوق سے بڑے شاعر ہیں۔ یہ ثابت کرنے کے لیے انھوں نے مومن کی غزلیت کی رنگینی اور شخصیت کی ہمہ گیری کو دلیل بنایا ہے۔ اس سے بھی اطمینان نہ ہوا تو عدم مقبولیت کے اسباب بیان کیے ہیں۔

نیاز فتح پوری مومن کے سب سے بڑے مداح ہیں۔ انھوں نے مومن کی فارسی تراکیب پر خاص توجہ دی ہے اور اس صفت کا غالب سے موازنہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

> مومن فارسی ترکیبیں استعمال کرنے میں بھی خاص ملکہ رکھتے تھے اور اس باب میں جو چیز انھیں غالب سے ممتاز کرتی ہے، وہ ترکیبوں کی نزاکت ہے، نہ کہ ان کا اغلاق۔

غالب کی فارسی ترکیبوں میں اشکالِ لفظی کے ساتھ وقتِ معنی پیدا ہوتی ہے۔ برخلاف مومن کے کہ ان کے ہاں ترکیبوں کی لطافت کے ساتھ مفہوم وسیع ہو جاتا ہے..... اس میں شک نہیں کہ مومن و غالب دونوں نے فارسی ترکیبوں کے استعمال میں عرفی و بیدل کا تتبع کیا اور بہت سی ترکیبیں وہی یا اسی نوع کی اختیار کیں جو عرفی و بیدل کے یہاں پائی جاتی ہیں لیکن یہ بھی یقینی ہے کہ اس بات میں مومن کو نہ صرف اولیت بلکہ افضلیت حاصل ہے اور غالب کے نقوش نقشِ ثانی کا حکم رکھتے ہیں گو ''بہتر ز اول'' نہ ہوں۔(1)

غالب کا کلام انتخاب ہے۔ نیاز فتح پوری نے بجا طور پر لکھا ہے کہ غالب کے اردو کلام کا بڑا حصہ محض انھیں ثقیل تراکیب کی وجہ سے حذف ہو چکا ہے۔ ان کی نشاندہی درست ہے کہ موجودہ نسخے میں بھی ان کی مثالیں مل جاتی ہیں۔ چونکہ یہ تراکیب مومن کے کلام میں فطری طور پر پیوست ہیں، اسی لیے انھیں حذف کرنے کی ضرورت نہ پڑی۔ قبولیت میں بھی کوئی مسئلہ پیش نہیں آیا۔ اس سلسلے میں نیاز صاحب نے غالب کا شعر نقل کرتے ہوئے لکھا ہے:

طرزِ بیدل میں ریختہ کہنا   اسد اللہ خاں قیامت ہے

یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ غالب نے بیدل کو سامنے رکھ کر فارسی ترکیبیں استعمال کیں، لیکن یہ بھی یقینی ہے کہ اس کی تحریک پیدا ہوئی مومن کے کلام کو دیکھ کر۔ پھر چونکہ غالب اپنی فطرت کی بنا پر یہ نہ چاہتے تھے کہ لوگ مومن کا متبع سمجھیں۔ اس لیے انھوں نے اس میں بہت زیادہ گہرا رنگ پیدا کرنا چاہا اور اس طرح کلامِ مومن سے امتیاز پیدا کرنے کی کوشش میں اول اول ان کے قلم سے اس قسم کے اشعار نکلے جو باوجود ثقلِ تراکیب کے کوئی ندرتِ مفہوم نہ رکھتے تھے۔(2)

یہ سچ ہے کہ آدمی اپنے بعض معاصرین سے متاثر ہوتا ہے لیکن یہ کہنا کہ غالب نے مومن سے متاثر ہو کر فارسی تراکیب استعمال کیں، محض قیاس پر مبنی ہے۔ نیاز صاحب کی اس رائے میں کوئی تعصب نہیں۔ انھوں نے یہ وطیرہ اختیار کیا کہ مومن کو بڑا ثابت کرنے کے لیے غالب کو چھوٹا

ثابت کیا جائے۔ ان کی بات سے متفق ہونا ضروری نہیں، لیکن نیت پر شبہ کرنا بھی مناسب نہیں۔ ان کا ہر نکتہ توجہ طلب ہے۔ انھوں نے مثالوں کے ذریعے فارسی تراکیب کی نشاندہی کی ہے۔

غالب اور مومن کا موازنہ تقریباً مومن کے ہر ناقد نے کیا ہے، کلیم الدین احمد اس سلسلے میں جارحانہ انداز اختیار نہیں کرتے۔ وہ شکایت کرتے ہیں کہ اردو غزلوں میں تک بندی زیادہ ہے۔ لیکن مومن کے باب میں اعتراف کرتے ہیں:

> غالب اور مومن اس حقیقت سے واقف تھے اور اپنی بہترین دماغی صلاحیتوں سے اپنے شعروں میں کام لیتے تھے۔ اس لیے غالب اور غالب سے بھی کچھ زیادہ مومن کے شعر صرف ہمارے جذبات ہی کو نہیں بھڑکاتے بلکہ ہمیں غور و فکر کی بھی دعوت دیتے ہیں۔ مومن کے سیدھے سادے شعروں میں بھی دعوتِ فکر موجود ہے۔ (3)

> غالب کے مشہور ناقد شیخ محمد اکرام نے ''آثارِ غالب'' میں غالب کے سلسلے میں مومن پر بھی توجہ دی ہے اور دیگر شعرا سے بھی غالب کا موازنہ کیا ہے۔ موازنے کا رویہ معاندانہ نہیں ہے۔ پہلے تو انھوں نے غالب اور مومن میں جو بہت سی باتیں مشترک تھیں ان کا ذکر کیا۔ مثلاً دونوں کو فطرت نے ذہین دل و دماغ کا مالک بنایا تھا۔ ان میں خود پسندی بڑھی ہوئی تھی۔ ایک سطح پر دونوں ناسخ کے مداح اور مقلد تھے۔ ان کے یہاں فارسیت اور تصنع آمیز عناصر نمایاں ہیں۔ دونوں معنی آفرینی اور خیال بندی کے دیوانے تھے۔ دونوں زبان و مضمون کی سطح پر اعلیٰ طبقے کے ترجمان تھے اور شاہ نصیر اور ذوق کے مقبول عام اشعار اور نظیر اکبرآبادی کے عوام پسند کلام کے مخالف تھے۔ نازک خیالی اور دقت پسندی کے قائل تھے۔ پرانے مضامین میں نئے اسلوب کی تلاش کے لیے دونوں بڑا دماغ صرف کیا کرتے تھے۔ محذوفات دونوں کے کلام میں پائے جاتے ہیں۔ (4)

شیخ محمد اکرام نے جو نتائج نکالے ہیں، وہ قابل دید ہیں۔ یہاں انھیں دو اقتباس کی صورت میں کیا جاتا ہے:

یہ اردو ادب کی بدقسمتی تھی کہ مومن نے چیستاں گوئی اور مضمون آفرینی کو کمال شاعری سمجھا۔ ورنہ جو معنی یاب طبیعت اور دل گداختہ انھیں ازل سے ملا تھا اگر وہ اسے پرانے مضامین میں پیچ دے کر نئے پہلو نکالنے کے بجائے اپنی جودت طبع کے لیے نئے میدان تلاش کرنے یا غزل میں اپنے دلی جذبات کے اظہار کے لیے صرف کرتے تو اردو ادب پر ان کا بڑا احسان ہوتا۔ اب بھی ان کے کئی اشعار ہیں جن کا جواب صرف دیوان غالب میں ملے گا۔(5)

مومن کو خدا نے زبردست دل و دماغ دیا تھا اور ان کا اردو شاعری میں بہت بلند مرتبہ ہے۔ لیکن یہ امر قابل افسوس ہے کہ انھوں نے اپنی تیز نقادانہ نگاہ بیشتر دوسروں کے عیوب واسقام ڈھونڈنے کے لیے وقف رکھی۔ اس سے اپنی اصلاح میں پوری مدد نہ لی۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان کی نئی ترقی رکی رہی اور شاعرانہ عروج وارتقا کے جو مدارج غالب کے کلام میں ہیں مومن کے ہاں معدوم ہیں۔(6)

شیخ محمد اکرام نے علمی بنیادوں پر غالب اور مومن کا مطالعہ کیا۔ اس لیے ان سے اختلاف کی صورتیں کم سے کم ہیں۔ غالب اور مومن کی بحث میں اس بات پر اصرار کرنا غالب مومن سے بڑے شاعر ہیں، برا نہیں ہے۔ برائی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب غالب کے سامنے یہ کہہ دیا جائے کہ مومن کی شاعری نہایت معمولی ہے۔ جس طرح اقبال نے مومن کی شاعری کو بازاری کہا مگر ان سے پہلے سرسید نے ''آثار الصنادید' میں مومن کے بارے میں نہایت توصیفی اور اعتراف سے پر جملے لکھے ہیں۔ موازنے کی بنیاد اگر افہام وتفہیم کی غرض سے ہو تو کوئی برائی نہیں، لیکن اگر مقصد کسی کو نیچا دکھانا ہو تو اس سے غیر سنجیدہ بات نہیں ہو سکتی۔ مومن پر مضامین کافی لکھے گئے ہیں اور بڑی اہم شخصیات نے لکھے ہیں۔ یہاں ہر مضمون کا ذکر کرنا جو غالب اور مومن سے متعلق ہو، ممکن نہیں۔ غالب کے خط (21 مئی 1852) کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے جس میں انھوں نے مومن سے اپنی دوستی کا ذکر کیا ہے۔ اس اقتباس سے بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جاتی ہیں:

مومن خاں میرا ہم عصر تھا اور یار بھی تھا۔ بیالیس تینتالیس برس ہوئے یعنی

چودہ چودہ پندرہ پندرہ برس کی میری اور اس مرحوم کی عمر تھی کہ مجھ میں اس میں ربط پیدا ہوا۔ اس عرصے میں کبھی کسی طرح کا رنج و ملال درمیان نہیں آیا۔ حضرت چالیس چالیس برس کا دشمن بھی نہیں پیدا ہوتا، دوست تو کہاں ہاتھ آتا ہے۔ یہ شخص بھی اپنی وضع کا اچھا کہنے والا تھا۔ طبیعت اس کی معنی آفریں تھی۔

یہ سچ ہے کہ مومن پر اتنا نہیں لکھا گیا جتنا غالب پر لکھا گیا لیکن مومن پر جتنا بھی لکھا گیا ہے اس کی روشنی میں افہام و تفہیم کو ایک تسلسل اور تحریک ملی ہے۔ کچھ اہم لوگوں نے توجہ ضرور دی، لیکن بعض حضرات سرسری بھی گزر گئے۔ اس لئے مومن کے کلام کو نئی تنقیدی بصیرتوں اور وسائل کی روشنی میں پڑھنے اور پرکھنے کی ضرورت ہے۔ معاصر تنقید نے اب تک مومن شناسی کا قرض ادا نہیں کیا۔ یہ کام باقی ہے۔

حوالے

(1) نیاز فتح پوری، نگار، مومن نمبر، تیسرا ایڈیشن مع اضافہ، 1964، پاکستان، ص:12

(2) نیاز فتح پوری، نگار، مومن نمبر، تیسرا ایڈیشن مع اضافہ، 1964، پاکستان، ص:15-14

(3) کلیم الدین احمد، اردو شاعری پر ایک نظر (اول)، 2011 (اشاعت ثانی)، بیک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ، ص:156

(4) شیخ محمد اکرام، آثار غالب، مطبع: مرکنٹائل پریس، لاہور، ناشر: تاج آفس، محمد علی روڈ، بمبئی، ص:204-302

(5) ایضاً، ص:306

(6) ایضاً، ص:309

✿✿✿

فیروز بخت احمد

بازیابیِ حویلی غالب کی داستان

یوں تو غالب نے اپنی زندگی میں نہ صرف بے تحاشہ سفر کیا بلکہ وہ غالباً ایک ایسے شاعر ہیں کہ جنہوں نے بے شمار قیام گاہوں میں اپنی زندگی گزاری۔ چاہے وہ آگرہ میں رہے ہوں، رامپور میں سکونت اختیار کی ہو، بنارس میں رہے ہوں، پٹیالہ میں حکیم محمود خان کی قیام گاہ میں رہے ہوں، ہمدرد دواخانے کے سامنے گلی قاسم جان میں داخل ہوتے ہی دائیں طرف کٹروڑہ والی حویلی ہو، اسمٰعیل خان کا مکان ہو کہ جس کا کرایہ پانچ روپیہ آٹھ آنے تھا، اپنے سسر نواب الٰہی بخش خان معروف کے مسکن یعنی محل سرا میں وقت گزارا ہو، کلکتہ میں رہے ہوں یا کہیں بھی رہے ہوں، انہوں نے ایک بھرپور زندگی گزاری۔ جہاں تک ان کی آخری قیام گاہ یعنی جسے حویلیِ غالب کے نام سے جانا جاتا ہے، اس کو بطور ایک یادگار محفوظ کرانے کے لیے جس جدوجہد کا سامنا اس حقیر اور ناچیز خدمت گار نے کیا تھا، وہ خود میں آپ سب کے لیے ایک دلچسپ اور انوکھی داستان ہے۔

پرانی دہلی کے اس شاہجہاں آبادی خطے میں غالب کی یہ رہائش گاہ اب ان کی آخری سکونت کے طور پر جانی جاتی ہے۔ دراصل تمام عمر شاعری کرنے کے بعد اور حاکم وقت شہنشاہ بہادر شاہ ظفر سے قربت ہونے کے باوجود، غالب کا ذاتی مکان نہ ہوا۔ غالب کی گلی قاسم جان والی یہ آخری قیام گاہ ان کے انتقال کے بعد مختلف ہاتھوں میں منتقل ہوتی رہی۔ ویسے اس کی ملکیت شریف خانی حکیموں کی ملکیت تھی۔ غالب کے وقت میں یہ ایک وسیع وعریض حویلی تھی جس کا رقبہ 400 گز سے بھی زیادہ تھا۔ اور قاسم جان کی گلی سے لے کر کنرہ عالم بیگ تک یہ پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے کئی مالک اور کرایہ دار بدلے۔

راقم بچپن میں اپنی پہلی دانش گاہ یعنی تعلیمی سماجی مرکز جاتے ہوئے۔ اسی حویلی کے آگے سے

گزرا کرتا تھا۔ بنیادی تعلیم کے لیے یہ ایک اعلیٰ و میعاری دانش گاہ تھی۔ جب ہم احاطہ کالے صاحب سے بارہ دری شیرِ افغان تک پیدل جاتے تھے تو ہمارے کندھے پر بستہ لٹکا ہوتا تھا جس میں اردو، ہندی، انگریزی اور حساب کی کاپیاں ہوتی تھیں، سلیٹ اور چاک رکھے ہوتے تھے، سرکنڈے کا اردو لکھنے والا کٹ لگا ہوا قلم ہوتا تھا، روشنائی ہوتی تھی جو پڑیوں میں کالے رنگ کے چورے سے بنتی تھیں اور ٹین کی دوات میں رہتی تھیں جس کے اوپر ربر کی ڈاٹ لگی رہتی تھی تاکہ سیاہی نہ گرے۔ ہم لوگ یہ گانا گاتے ہوئے جاتے تھے، ''تختی پہ تختی تختی پہ دانہ کل کی چھٹی پرسوں کو آنا! دراصل یہ وہی دور تھا کہ جب ہم دیکھا کرتے تھے کہ ہندوستانی دواخانہ یعنی حکیم اجمل خاں کے دواخانے کے سامنے ایک لکڑیوں کی ٹال تھی جس میں لکڑی تو بکتی ہی تھی، ساتھ ہی ساتھ لکڑی کا کوئلہ اور پتھر کا کوئلہ بھی بکا کرتا تھا۔ ہم لوگ بسا اوقات یہ بات نوٹ کرتے تھے کہ اس لکڑی کی ٹال میں انگریز سیلانی کبھی تو اپنے کیمروں سے تصویریں کھینچتے دکھائی دیتے تو کبھی مووی کیمروں سے فلم بناتے دکھائی دیتے۔ یہی نہیں، بہت سے خوشباش اور بہترین کپڑوں میں ملبوس ہندوستانی بھی یہاں دکھائی دیتے۔ دہلی کی تاریخی گلی، گلی قاسم جان میں حویلیِ غالب کا دروازہ محراب نما اور اس کے اندر کی دیواریں و دو چھتی لخوری اینٹوں سے بنی ہوئی تھیں۔ دائیں طرف ایک ایس۔ٹی۔ڈی۔ کی دکان اور بائیں جانب تین در ہوا کرتے تھے۔ تمام حویلی بڑی خستہ حالت میں تھی اور در حقیقت در کی، تڑختی دیواروں کے بیچ سے اکثر سبزہ زار دکھائی دیا کرتا تھا، ٹھیک اسی طرح سے جیسے کہ غالب کا یہ شعر: ''اُگ رہا ہے در و دیوار پہ سبزہ غالب / ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے!''

سات، آٹھ سال کی عمر کے بعد جب تھوڑا اور ہوش آیا تو پتہ چلا کہ اگلے وقتوں میں کوئی نامی گرامی شاعر مرزا غالب کے نام سے ہوا کرتے تھے جو یہاں مکین تھے۔ اسی دور سے غالب کی اس قیام گاہ کے تعلق سے تجسس بڑھتا گیا اور ساتھ ہی ساتھ رغبت بھی۔

جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، غالب کی اہمیت کا اندازہ بھی ہوتا چلا گیا اور طبیعت کو یہ بات بھی

ستانے لگی کہ آخر بین الاقوامی شہرت یافتہ اردو کے اس شاعر کی رہائش گاہ اتنی بدحال و نامراد کیوں ہے۔ راقم نے تب ہی سے اس بات کا فیصلہ کرلیا کہ اپنی تعلیم کے جاری رہتے ہوئے یا اس کے بعد وہ غالب کے مکان کو ایک یادگار میں تبدیل کرانے کی مکمل جدوجہد کرے گا۔ اس نے اسی وقت سے اس کی کاوشیں شروع کردی۔ چونکہ بچپن سے ہی قلم کا ساتھ رہا، راقم نے غالب کے اوپر بچوں کے رسائل یا بڑوں کے اخبارات میں بچوں کے کالموں میں مضامین لکھنے شروع کردیے۔ قلم کی اس تگ و دو کی ہمت افزائی ہوئی تو تحریر سے دلی، دماغی اور روحانی تسکین کا احساس ہوا۔ تختی کے اوپر سرکنڈے کے قلم سے خوش خطی کے بعد یہ سلسلہ کاغذوں پر جاری رہا۔

برسرِ روزگار ہونے کے بعد راقم نے مختلف سرکاری ایجنسیوں، سیاست دانوں اور ایوان اقتدار سے جڑی چھوٹی بڑی ہستیوں سے تحریری گزارش کی کہ وہ لوگ حویلی غالب کو محفوظ کریں۔ کبھی میونسپل کارپوریشن تو کبھی علاقہ کے کارپوریٹر یا پارلیمانی ممبر یا کبھی مختلف وزارتوں کو خطوط لکھے گئے، جن کا جواب تک دینے کی کسی نے زحمت نہ کی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے غالب کو چاہنے والے تو بہت ہیں مگر ان کی حویلی کو محفوظ کرنے میں کسی کو دلچسپی نہ تھی۔

راقم بھی کہاں ہمت ہارنے والا تھا۔ اس نے اردو، ہندی و انگریزی کے جرائد و اخبارات میں مستقل طور سے بازیابی حویلیِ غالب کے تعلق سے مضامین تحریر کرنے شروع کردیے۔ اسی دوران ہمارے ایک ہمدرد دوست اور معروف قانوندان جناب محمد اطیب صدیقی صاحب نے رائے دی کہ کب تک کاغذ کالے کرتے رہوگے، حویلیِ غالب محفوظ ہونے والی نہیں ہے۔ ان کا خیال تھا کہ جب تک حویلیِ غالب کو محفوظ کرانے کے لیے ایک مقدمہ برائے فلاح عامہ دہلی ہائی کورٹ میں دائر نہیں کیا جائے گا تب تک کوئی حاصل وصول نہیں ہونے والا۔ راقم کو یہ بات سمجھ میں آگئی اور اس نے وکیل صاحب سے دریافت کیا کہ اس کے لیے کیا کرنا ہوگا۔ اس پر انہوں نے بتایا کہ راقم کسی کثیر الاشاعت انگریزی روزنامہ میں حویلیِ غالب پر مضمون شائع کرائے تاکہ اس کی بنیاد پر یہ مقدمہ برائے فلاح عامہ شروع کیا جائے۔ راقم نے ''ہندوستان ٹائمز'' کے مورخہ 25 ستمبر

1996 میں ایک مضمون بعنوان ''اے کلچرل ڈ-تھ'' (A Cultural Death) شائع کرایا۔ اس کو مقدمہ دائر کرنے کی بنیاد کے طور پر استعمال کیا گیا۔ یہی نہیں راقم نے دیگر اردو، ہندی و انگریزی اخبارات میں بھی، جیسے ''ٹائمز آف انڈیا''، ''انڈین ایکسپریس''، ''دا ہندو''، ''دا پائنیر''، ''السٹریٹڈ ویکلی''، ''قومی آواز''، ''راشٹریہ سہارا''، ''سیاست'' (حیدرآباد)، ''انقلاب'' (بمبئی) اردو ہفت روزہ، ''نئی دنیا''، ''اخبارِ نو''، ''عوام'' (دہلی)، ''نو بھارت ٹائمز''، ''جن ستا''، ''دینک ہندوستان''، ''دینک جاگرن''، ''پنجاب کیسری''، ''ویر ارجن''، ''کبیر ٹائمز''، ''جے وی جی ٹائمز'' وغیرہ میں بھی مضامین شائع کروائے۔

اس وقت حویلیِ غالب میں ہیٹر کا ایک کارخانہ تھا اور بلڈنگ میٹریل کی فروخت کا سلسلہ تھا۔ وہاں پر بسے لوگ اتنی آسانی سے اس جگہ کو خالی کرنے والے نہیں تھے۔ حویلیِ غالب کا میونسپل وارڈ کے خسرہ کا مکان نمبر 2290 سے 2300 تک تھا جس کے لیے پٹیشن داخل کی گئی ۔ یہ مقدمہ جسٹس چندر موہن نیر کے کورٹ میں لگا۔ مقدمہ کو فلاحی تنظیم ''فرینڈز فار ایجوکیشن'' کی معرفت راقم کو بحیثیت اس کے چیئرمین داخل کیا گیا۔

درخواست میں کورٹ سے اپیل کی گئی کہ یادگارِ غالب میں ایک لائبریری، ایک چھوٹا سا میوزیم اور ایک دفتر و اسٹور بنایا جائے کہ جہاں غالب کے دیوان و تصاویر بآسانی میسر ہوں۔ اس کیس کے وکیل مسٹر صدیقی نے یہ اپیل بھی کی کہ حویلی کے اندر مقیم لوگوں کو ڈی۔ ڈی۔ اے اور دلی میونسپل کارپوریشن کی طرف سے جد از جلد ٹھیک اسی طرح سے متبادل جگہیں الاٹ کی جائیں کہ جیسے راقم کی کوششوں سے مزارِ ذوق کے سلسلہ میں پہاڑ گنج کے نبی کریم علاقہ کی چنیوٹ بستی کے سات مکان مالکوں اور دودکانداروں کو دی گئی تھیں۔ دراصل مزارِ ذوق پر جو کہ کلو کا تکیہ قبرستان میں ہوا کرتا تھا، پارٹیشن کے بعد شرنارتھیوں نے قبضہ کر لیا تھا اور 1961 میں دہلی میونسپل کارپوریشن نے تمام مزارات و قبروں کو مسمار کر یہاں مردوں و خواتین کے بیت الخلا بنوا دیے۔ یہاں پر ایک نہ دو بلکہ پورے 14 بیت الخلا تھے جن میں 7 خواتین کے تھے تو باقی 7 مردوں کے تھے۔

حویلیِ غالب میں جو لوگ مقیم تھے، انہیں متبادل جگہیں فراہم تو کر دی گئی تھیں مگر ان سے وہ مطمئن نہ تھے۔ بقول خاکسار شفیق الدین، حویلیِ غالب کو بچائے رکھنے میں ان کے والد جناب ابراہیم صاحب کی بڑی خدمات وقربانیاں تھیں۔ جو جگہ کورٹ کے آرڈر پر یادگارِ غالب کے لیے لی گئی تھی، اس میں سب سے بڑا حصہ شفیق الدین صاحب کا ہی تھا۔ انہیں شکایت تھی کہ جو جگہ انہیں دی گئی ہے، وہ مارکیٹ ریٹ کے اعتبار سے بہت کم ہے۔

عدالت میں وکیل صاحب کے ذریعہ یہ تجویز بھی رکھی گئی کہ اس کام کی سرپرستی کے لیے ایک کمیٹی بھی بنائی جائی جو بطور پریشر گروپ یہ دیکھے کہ تمام شعبے صحیح وقت پر اپنے کام انجام دے رہے ہیں۔ کمیٹی کے ممبران میں جناب مشیر الحسن، قائم مقام وائس چانسلر، جامعہ ملیہ اسلامیہ، پروفیسر گوپی چند نارنگ، راقم، جناب مجتبیٰ حسین زیدی اور محکمۂ آثار قدیمہ، حلقۂ دہلی کے ڈائرکٹر جناب دھرم ویر شرما کے نام تجویز کیے گئے۔ یہ کمیٹی تو قائم ہو گئی مگر بہت زیادہ دنوں تک نہیں چلی کیونکہ کئی ممبران ہم خیال نہ تھے۔ اس بات کے زیر نظر راقم نے عدالت کو رائے دی کہ اس قسم کی کمیٹیاں بہت دنوں تک متحد نہیں رہ پاتی ہیں، لہٰذا مناسب یہی رہے گا کہ سرکاری ایجنسیاں یا ادارے اس کام کو انجام دیں۔ تاریخیں لگتی گئیں اور آخر 8 اگست 1997 کو جسٹس چندر موہن نیر نے ایک تاریخی فیصلہ سنایا کہ 6 ماہ کے اندر دہلی سرکار کو چاہیے کہ غالب کی رہائش گاہ کو محفوظ کر اس شاعر عظیم کے شایانِ شان ایک ایسی یادگار تعمیر کی جائے کہ جو بے مثال ہو۔

اس کے بعد کا قصہ سنیے! جسٹس سی۔ ایم۔ نیر تو ایک تاریخ ساز فیصلہ دے کر سبکدوش ہو گئے مگر دہلی کی مختلف ایجنسیوں نے یادگار غالب کے ساتھ انصاف تو دور، کورٹ کے دس فیصد حکم کو بھی نہیں مانا۔ معمولی سی ٹیپ ٹاپ یعنی جس کو انگریزی میں ''کاسمیٹک ریپیرز'' (Cosmetic repairs) کہا جاتا ہے، اس طرح کا گھٹیا کام کیا۔ ایسا محسوس ہوتا رہا تھا کہ جیسے یہ ایجنسیاں غالب کی رقیب ہوں۔ غالب کی چند فوٹو کاپی کی گئی تصویر کو لیمینٹ کرا کر نہایت ہی بھونڈے طریقے سے چسپاں کر دیا گیا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ مانو دہلی سرکار اس کام سے اپنا پیچھا چھڑانا چا

ہے۔اتفاق سے جب 1997 میں پاکستان کے معروف شاعر مرحوم احمد فراز دہلی تشریف لائے تو مرزا غالب کی ویران حویلی بھی دیکھنے گئے۔اس کی تنزلی دیکھتے ہوئے انہوں نے اس وقت ایک چٹکی لی کہ اگر ہندوستانی حکومت کے پاس غالب کی یادگار بنانے کے ذرائع نہیں ہیں تو وہ بذات خود ہی لاکھوں ڈالر اس کام کے لیے غیر ممالک میں بسے ہندوستانی و پاکستانی لوگوں سے جمع کر سکتے ہیں۔ راقم کو یہ بات سن کر بڑی شرم محسوس ہوئی مگر اس نے ان کی پیش کش کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ ہم ہندوستانی، جیسا بھی ہے، خود اس کام کو کرنا پسند کریں گے۔

جب راقم کو پتہ چلا کہ حویلیِ غالب کے اصل 412 گز رقبہ کی جگہ کورٹ نے محض 130 گز جگہ ہی دی ہے، تو اسے بڑا اچنبھا ہوا۔شروع میں تو کافی بڑا رقبہ تھا جس میں مسجد کو چھوڑتے ہوئے ''کیپٹل لیدر آرٹ اسٹور'' و دیگر دکانیں و مکانات شامل تھے۔ یہی نہیں، راقم نے پہلی منزل کو بھی اکوائر کرنے کا مطالبہ کیا تھا جس پر کوئی توجہ نہیں دی گئی۔

عدالت کے حکم پر، اس یادگار کی تعمیر کا ذمہ چونکہ دہلی سرکار کے ڈپارٹمنٹ آف آرکیٹیچر کو دیا گیا تھا، اس کے انچارج اس وقت ایک مسٹر ماکھن لال ہوا کرتے تھے۔ان سے جب راقم نے درخواست کی کہ تزئین کاری کے سلسلہ میں اس سے رجوع کرلیں تو انہیں یہ بات کچھ ناگوار سی گزری جس کے بعد راقم نے وزیر اعلیٰ محترمہ شیلا دیکشت صاحبہ کو خط بھی لکھا۔اس خط کا کوئی جواب جیسا کہ امید تھی ،نہیں آیا۔

اللہ، اللہ کر کے حویلی تیار کی گئی۔15 فروری 2000 کو جب اس حویلی کو دہلی سرکار کی جانب سے عوام الناس کی خدمت میں پیش کیا گیا تو ایک بہت بڑی تقریب عمل میں آئی جس میں اس وقت دہلی کے لیفٹیننٹ گورنر جناب وجے کپور، وزیر اعلیٰ محترمہ شیلا دیکشت صاحبہ، ممبر پارلیمنٹ جناب وجے گوئل، ہاروا یوسف، ایم۔ایل۔اے۔، آئی۔سی۔سی۔آر۔ کے ڈائریکٹر جناب پون کمار ورما پروفیسر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر خلیق انجم، ڈاکٹر عقیل احمد، شاہد ماہلی وغیرہ موجود تھے۔مزے کی بات یہ کہ اس تقریب کا کوئی دعوت نامہ راقم کے پاس نہیں آیا۔راقم کو جب میڈیا

ایجنسیوں سے پتہ چلا کہ اس طرح کی کوئی تقریب ہے کہ جس میں دہلی سرکار اس حویلی کو اپنی جانب سے عوام کو پیش کر رہی ہے تو اس نے وہاں بن بلائے مہمان کی طرح ہی صحیح، پہنچنے کا فیصلہ کیا۔ تمام بازار بلی ماران وگلی قاسم جان کو پھولوں سے سجادیا گیا تھا۔ دونوں جانب سے ٹریفک پر بھی پابندی لگا دی گئی تھی۔ تقاریر کا سلسلہ شروع ہوا تو عزت مآب جناب وجے کپور صاحب نے محترمہ شیلا دیکشت و ہارون یوسف کی تعریفوں کے پل باندھ دیے۔ یہی سلسلہ محترمہ شیلا دیکشت صاحبہ نے جاری رکھا اور ووٹ بینک کی سیاست کی نبض کو سمجھتے ہوئے اس کا سہرا علاقے کے ایم۔ ایل۔ اے۔ جناب ہارون یوسف کے سر رکھا۔ ادھر ہارون صاحب نے بھی اپنی تقریر میں وزیر اعلی صاحبہ کو پورا کریڈٹ دینے میں کوئی کثر نہیں چھوڑی۔

ہمیں یہ سب بڑا عجیب وغریب محسوس ہو رہا تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ کسی صلے یا ستائش کی کوئی تمنا نہ تھی کیونکہ راقم نے اس حویلی کو غالب کے چاہنے والوں کے لیے ہی محفوظ کرانے کی نیت کی تھی۔ ہاں اسے یہ ضرور ناگوار گزرا کہ اس کی تحریک کو سیاستدانوں نے یرغمال کر اپنی سیاسی دکانیں چمکانے کے لیے اور ووٹ کی سیاست گرمانے کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا۔

یہ سلسلہ یہیں نہیں تھما، شہر کی ایک مشہور ڈانسر کو بھی غالب کی یاد ستانے لگی اور انہوں نے اس شاعر کو بخوبی بھنانے کا بڑا اچھا پلان بنالیا۔ انہوں نے وزیر اعلیٰ سے ہر سال ایک پروگرام ''یادگارِ غالب'' کا بجٹ تیار کر ان کو دینا شروع کر دیا جس میں انہوں نے مختلف ترکیبوں جیسے، رقص، مشاعرہ، غالب کینڈل مارچ وغیرہ کے ذریعہ یہ پروپیگنڈہ کرنا شروع کر دیا کہ غالب سے انہیں بڑی الفت ہے، یہ کہ وہ سالہا سال سے ان کی شاعری پر رقص کرتی چلی آ رہی ہیں اور یہ کہ اس حویلی کو انہوں نے محفوظ کرایا ہے۔ اس کے لیے ایک سوسائٹی ''غالب میموریل موومنٹ'' کی بھی انہوں نے داغ بیل ڈالی جس میں انہوں نے جانی مانی ہستیوں کو جیسے جناب عابد حسین، گلزار، کسم انسل، پون کمار ورما وغیرہ کو بھی جوڑ لیا۔

دہلی سرکار کے علاوہ، ان رقاصہ صاحبہ نے آئی۔ سی۔ سی۔ آر۔ کے تعاون سے بھی ایک پروگرام ''شمع جلتی ہے ہر رنگ میں'' کرنا شروع کر دیا جس کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔ حالانکہ

حویلیِ غالب کسی کی ذاتی ملکیت نہیں بلکہ چہار دانگِ عالم میں ان کے چاہنے والوں کی میراث ہے، مگر کسی کو بھی کوئی حق نہیں ہے کہ کسی دوسرے کی محنت و مشقت اور عدالت کی کارروائی کے ذریعہ حویلیِ غالب کو محفوظ کرانے کی کوششوں کو اپنی جھولی میں ڈال لے۔ اب ہو یہ رہا ہے کہ کبھی کوئی فلمی ڈائریکٹر، کبھی دیگر۔ سیاستدان کبھی کوئی اور، غالب کے نام کو بھنا رہا ہے۔ یہ سچائی ہے کہ راقم نے اپنا قیمتی وقت دے کر اور اپنی خون پسینے کی کمائی سے غالب کی اس قیام گاہ کو محفوظ کرایا مگر کبھی اس شاعرِ عظیم کے نام کو بھنایا نہیں۔

اخیر میں راقم یہ بتانا چاہے گا اس یادگار کو ایک جیتی جاگتی حویلی کی شکل میں زندہ رکھنے کے لیے اس نے وزیر اعلیٰ شیلا دیکشت صاحبہ کو کئی مرتبہ خطوط دیے کہ اس میں وہ ایک ریڈنگ روم، غالب کی کتابوں و تصاویر کے لیے اسٹور یا اردو سے جڑی کوئی سرگرمی جیسے علاقہ کے بچوں کے لیے کمپیوٹر پہ اردو سکھانا جیسے کام جاری رہنے چاہئیں۔ افسوس کہ ان کی جانب سے کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔ بیچ میں راقم کو پتہ چلا کہ حویلی کے اندر گارڈ اس آثارِ قدیمہ کا غلط فائدہ اٹھا رہا ہے تو اس نے دوبارہ کورٹ میں شکایت کر کے اس کو وہاں سے ہٹوایا۔ یہ گارڈ کی ہی وجہ تھی کہ اس نے حویلی میں ولیمہ کی تقریبات وغیرہ کے لیے جگہ دینی شروع کر دی جس کی شکایت نہ صرف پولیس اسٹیشن اور دلی سرکار کو کی گئی بلکہ میڈیا کو بھی اس کی اطلاع دی گئی۔ آج بھی راقم کی دیرینہ خواہش ہے کہ اس یادگار کو زندہ یادگار بنایا جائے، شام کو یہ اندھیرے میں ڈوب جاتی ہے اور حتیٰ کہ غالب کے یومِ پیدائش اور یومِ وفات کے، اس میں چراغاں نہیں ہوتا۔

کیا ہی اچھا ہو کہ یہاں پر سرکار ایک ریڈنگ روم اور غالب پر مختلف زبانوں میں کتابوں اور اردو و ہندی میں ترجمہ شدہ دیوانوں کی فروخت کا سلسلہ شروع کرے کیونکہ اس جگہ روزانہ دنیا کے مختلف حصوں سے غالب کے چاہنے والے آتے ہیں۔ کم سے کم ان کے لیے اتنا تو ہو کہ وہ مطالعہ گاہ میں کچھ دیر بیٹھ کر کچھ پڑھ لیں یا حویلی کے تعلق سے کچھ نوٹ کر لیں۔

✿✿✿

غالب اکیڈمی کی ادبی سرگرمیاں

یکم اپریل 2014 کو غالب اکیڈمی میں شعری نشست کا اہتمام

یکم اپریل 2014 کو غالب اکیڈمی، نئی دہلی میں ایک ادبی نشست کا اہتمام کیا گیا۔ جس میں ٹورنٹو رکینیڈا سے تشریف لائی محترمہ ذکیہ غزل صاحبہ نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ نشست کی صدارت جناب وقار مانوی صاحب نے فرمائی۔ اس موقع پر موجود شعرا نے اپنے کلام سے نوازا۔ منتخب اشعار پیش خدمت ہیں:

عشق کی خاک سے تعمیر ہوئی ہے مری　　سنگ ہے میرا مقدر گل تر اور کے ہیں　　شہباز ندیم ضیائی

بڑوں کی سرپرستی سے کسے انکار ہے، لیکن　　چمن گلزار ہوتا ہے نئے غنچوں کے آنے سے　　دریندر قمر بدپوری

دسترس کب ہو سکی نظروں کی زریں نقاب　　راز اس کی شوخیوں کا نقشِ پا سے کھل گیا　　ظفر مرادآبادی

میں کسی کی بھی پرستش کا گنہگار نہیں　　تو کسی کا بھی خدا ہوگا صنم ہے میرا　　سرفراز احمد فراز دہلوی

اہل نظر سے پوچھیے آتا ہوں میں نظر　　سب کو نظر جو آئے وہ منظر نہیں ہوں میں　　متین امروہوی

یہ ذہن میں بھی رکھو اپنے اس صدی کے لیے　　کہ دل میں پھول سی خوشبو ہو دوستی کے لیے　　عقیل نہٹوری

کاش ایسا ہو کہ تم اپنا شگفتہ چہرہ　　سامنے رہنے دو پیوستہ نظر ہونے تک　　وقار مانوی

رشتے کی یہ حد ہے آگے مت بڑھنا　　اس کے آگے چکنی مٹی پڑتی ہے　　معین شاداب

دل کر رہا ہے پھر تری محفل کی آرزو　　حالانکہ ہم ابھی تری محفل سے آئے ہیں　　نسیم عباسی

لہولہان ہوئی جا رہی ہے ہر تتلی　　ہوس پرستوں نے کیسے یہ گل کھلائے ہیں　　وسیم راشد

بے سبب زمانے کے مخمصے میں رہنا تھا　　زندگی تجھے شاید یوں مزے میں رہنا تھا　　ڈاکٹر واحد نظیر

چھین کر لے گئی آلودہ ہوا سبز لباس　　تن برہنہ سبھی اشجار نظر آتے ہیں　　اسرار رازی

آج کے شب تو کسی طور گذر جائے گی　　کل شب ہجر بتا دے تو کدھر جائے گی　　ذہینہ صدیقی

احمد کرے جو ذکر محمدؐ تو کیا ہوا؟　　ہر شخص پڑھ رہا ہے قصیدہ حضور کا　　احمد رئیس صدیقی

محبت دل سے دل تک راہ کو ہموار کرتی ہے　　ہوس انسان کو اکثر ذلیل و خوار کرتی ہے　　برقی اعظمی

کیا خبر تھی یہ مخالف اک جہاں ہوجائے گا　　دوستی کا نام بھی سود وزیاں ہوجائے گا
جانتا ہے چاند اپنی عمر کے لمحے غزل　　جس گھڑی ڈوبا یہاں روشن وہاں ہوجائے گا　　ذکیہ غزل

اس موقع پر بڑی تعداد میں لوگ موجود تھے جن میں اے آر رحمٰن، حنا آفرین، ریاض قدوائی، عظیم الدین، رضا فراز، اسفر فریدی اور سید شکیل احمد نظامی کے نام قابل ذکر ہیں۔ معین شاداب نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔

غالب اکیڈمی میں بہار میں تخلیقی نثر (آزادی کے بعد) پر مذاکرہ

غالب اکیڈمی، نئی دہلی کی جانب سے بروز ہفتہ 5/اپریل 2014 کو شام پانچ بجے غالب اکیڈمی، بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی میں ڈاکٹر قیام نیر کی کتاب بہار میں تخلیقی نثر (آزادی کے بعد) پر ایک مذاکرے کا انعقاد کیا گیا جس میں شہزاد انجم، مظہر احمد، مولا بخش، کوثر مظہری، سرور الہدیٰ نے شرکت فرمائی۔

19/اپریل 2014 غالب اکیڈمی میں مذاکرہ

19/اپریل 2014 کو شام ساڑھے چار بجے غالب اکیڈمی، بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی میں سید قمر الحسن کی کتاب ''جن سے الفت تھی بہت'' پر ایک مذاکرے کا انعقاد کیا گیا؛ جس کی صدارت پروفیسر الطاف احمد اعظمی نے کی۔ مذاکرے میں پروفیسر رشید الظفر، حکیم خورشید احمد شفقت اعظمی، پروفیسر ابن کنول، ڈاکٹر اشہر قدیر، جناب سہیل انجم شرکت فرمائی۔

3/مئی 2014 غالب اکیڈمی میں شعری نشست

3/مئی 2014 کو غالب اکیڈمی، نئی دہلی میں ایک شعری نشست کا اہتمام کیا گیا۔ جس میں مشہور شاعر جاذب ضیائی نے مہمان خصوصی کے طور پر شرکت کی۔ صدارت کے فرائض جناب وقار مانوی نے انجام دیے اور ڈاکٹر ظفر مرادآبادی نے نظامت کی۔ دہلی کے معروف شعرا نے اس موقع پر اپنے اشعار سنائے۔ منتخب اشعار قارئین کے لیے پیش خدمت ہیں۔

کروں جو شکر تو کس کس عطا کا شکر کروں　　مری طلب سے تری ہر عطا زیادہ ہے　　وقار مانوی
ہاتھ میرا بھی گریباں سے کوئی دور نہیں　　پر یہ گلیوں کے تماشے مجھے منظور نہیں　　نسیم عباسی

یہ اختلافی مسائل جناب روح کے ہیں ہمیں بدن کا تصوف دکھائی دینے لگا رؤف رضا
ہمیں آباد کرکے ایک دریا کے کنارے ہمارا نام بحرِ تشنگاں رکھا گیا ہے جاذب ضیائی
سماعتیں تری آواز کو ترستی ہیں تو لہجۂ حبشی کی طرح زباں سے نکل شہباز ندیم
بند آنکھیں روشنی سے بھر گئیں خواب سورج کے نشانے پر رہا پرویز جامعی
ہیں مصر سب اپنے اپنے جہل کی تائید میں خود سروں میں صاحب ادراک کی اوقات کیا ظفر مرادآبادی
علم رکھتے ہیں کسی کے نہیں محتاج کمال پیش کرتے ہیں ہنر عرضِ ہنر سے پہلے کمال جعفری
یہ حقیقت ہے مگر لوگ نہیں مانتے ہیں ہم تجھے ماہ نہیں مہر مبیں مانتے ہیں سرفراز احمد
لطف سب ان کے سمندر تو ستم اس کے پہاڑ اس کا ہر کام تصور سے بڑا ہوتا ہے ساز دہلوی
نہ سیاہی کا سمندر نہ فلک سا کاغذ کیسے لکھے کوئی تعریف زبانِ اردو جاوید رشید
نشۂ عظمت رفتہ کو اتارو سر سے سر جو باقی نہیں دستار میں کیا رکھا ہے اسرار رازی
ہوا کے دم پہ جو روشن ہے وہ چراغ ہوں میں مجھے بجھانے کی کوشش تمہیں مٹا دے گی مسیحا جونپوری
رچائے کتنی ہی سازشیں اب دماغ کوئی ہوا بجھانے کو جل اٹھا ہے چراغ کوئی سکندر عاقل
وفا پرست ہوں تصویر پاس رکھتی ہوں میں اس کی یادوں کی جاگیر پاس رکھتی ہوں ماہرہ سحر
جو خبر سرخیِ اخبار پہ رکھ آیا ہوں اس کا الزام میں اغیار پہ رکھ آیا ہوں برقی اعظمی
اب کسی دروازے پہ دی جائیں کیوں کر دستکیں اس محلے کا ہے ہر اک شخص پہچانا ہوا اجے عکس
میری غزلوں کی ہر صفت اس کی شعر میرے ہیں شعریت اس کی محمود عالم

اس موقع پر اسرار جامعی، نشتر امروہوی، ناگیش چندر نے بھی اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔

14 رمئی 2014 غالب اکیڈمی میں ماہانہ ادبی نشست

غالب اکیڈمی بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی میں 14 مئی 2014 کو شام ساڑھے پانچ بجے ایک ادبی نشست کا اہتمام کیا گیا جس میں ڈاکٹر نگار عظیم، ذکیہ ظفر، نسیم عباسی، متین امروہوی، سکندر عاقل، احمد علی برقی اعظمی، قیصر عزیز نے شرکت کی۔

9 راگست 2014 غالب اکیڈمی میں ادبی نشست

غالب اکیڈمی ہر ماہ دوسرے سنیچر کو ایک شعری نشست کا اہتمام کرتی ہے 9/اگست 2014 کو شام ساڑھے پانچ بجے غالب اکیڈمی، بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی میں ادبی نشست کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت ڈاکٹر ترنم ریاض نے کی۔ دوحہ قطر سے آئے مشہور شاعر جناب عتیق انظر نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ نشست میں انجم عثمانی، ریاض قدوائی، نسیم عباسی، متین امروہوی، نگار عظیم، ظہیر برنی، سکندر عاقل، ڈاکٹر احمد علی برقی نے کلام پیش کیا۔

20/ستمبر 2014 کو غالب کی یاد میں جلسہ

پوئٹری سوسائٹی آف (انڈیا) غالب اکیڈمی اور انڈیا انٹرنیشنل سینٹر کی جانب سے بروز ہفتہ 20/ستمبر 2014 کو شام چھ بجے انڈیا انٹرنیشنل سینٹر کانفرنس روم نمبر 1، نئی دہلی میں ایک جلسے کا اہتمام کیا گیا۔ جس کی صدارت ڈاکٹر ترنم ریاض نے کی۔ اس موقع پر پروفیسر قاضی عبید الرحمٰن ہاشمی، جناب فرحت احساس اور ڈاکٹر عقیل احمد نے اظہار خیال کیا۔

4/اکتوبر 2014 کو امجد اسلام امجد کے ساتھ ایک شام

اردو کے مشہور شاعر، ڈراما نگار، کالم نویس امجد اسلام امجد کے ساتھ ایک شام کا اہتمام غالب اکیڈمی، نئی دہلی میں 4 /اکتوبر 2014 شام چھ بجے کیا گیا۔ اس موقع پر امجد اسلام امجد نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ متین امروہوی، نسیم عباسی، احمد علی برقی اعظمی، گوربندر سنگھ عازم کوہلی، شہباز ندیم ضیائی، نگار عظیم، ابرار کرت پوری، سکندر عاقل، وریندر قمر نے اس موقع پر اپنے اشعار پیش کیے۔ جلسے کی صدارت ڈاکٹر ترنم ریاض نے فرمائی۔

25/اکتوبر 2014 کو غالب اکیڈمی میں علامہ شبلی پر کل ہند سیمینار

یہ عبرت کا مقام ہے اکیڈمیوں اور اداروں نے علامہ شبلی نعمانی کو جس طرح نظر انداز کیا اور کیا جارہا ہے وہ ہماری بدبختی کی بدترین مثال ہے۔ شبلی اردو ادب کی ایک ایسی عبقری شخصیت ہیں جن کا کوئی بدل نہیں ہے۔ وہ ایک متنوع اور کثیر الجہات شخصیت کے مالک تھے جنہوں نے جس موضوع پر بھی لکھا اس کا پورا پورا حق ادا کیا۔ ان خیالات کا اظہار غالب اکیڈمی کے زیر اہتمام علامہ شبلی نعمانی علیہ رحمہ کے سوویں وفات کے موقع پر منعقدہ ایک کل ہند سیمینار میں کیا گیا۔

علامہ شبلی کی بے مثال خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر عبدالحق نے کہا کہ علامہ شبلی اور علامہ

اقبال ایسی دو عبقری شخصیتیں ہیں جن کی مثال اردو ادب تو کیا، دنیا کے کسی زبان کے ادب میں نہیں ملے گی۔شبلی پہلے شخص ہیں جنہوں نے علم الکلام پر سب سے پہلے بحث کی ،تنقید نگاری کی ابتدا کی ، مرثیہ نگاری کو انیس اور دبیر کا موازانہ کر کے صنف کا درجہ دیا۔ انہوں نے کہا کہ شبلی ہی پہلے شاعر ہیں جنہوں نے انقلابی اور احتجاجی شاعری کی جس کی وجہ سے انہیں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی چھوڑنا پڑی۔

پروفیسر الطاف احمد اعظمی نے شبلی کے تعلیمی تصورات پر اپنا سیر حاصل مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ شبلی تعلیمی تفریق کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ 1857 کے حادثہ کے نتیجہ میں مذہبی اور جدید تعلیم کے دو الگ نظام بن گئے تھے۔اس کے خطرناک نتائج آج بھی ہم بھگت رہے ہیں۔ پروفیسر اعظمی نے کہا کہ شبلی قدیم اور جدید کے خوشگوار امتزاج کے پرزور وکیل تھے جسے وہ معجون مرکب سے تعبیر کرتے تھے اور کہتے تھے یہی تعلیمی نظام مسلمانوں کے دکھ ودرد کا اصل مداوا ہے۔انہوں نے کہا کہ شبلی یہ بات اس دور میں کہہ رہے تھے جب اس پر عمل کرنا بڑا مشکل تھا۔تاہم انہوں نے ہمت نہیں ہاری۔اپنے آبائی وطن اعظم گڑھ میں اس طرز کا ایک اسکول قائم کیا، نیز جب ندوۃ العلما لکھنو میں معتمد تعلیم بنائے گئے تو اس وقت بھی انہوں نے سخت مخالفتوں کے باوجود جدید علوم بالخصوص انگریزی اور سنسکرت کو نصاب میں داخل کرایا حالانکہ اس فیصلہ کی سخت مخالفت ہوئی۔انہوں نے کہا کہ شبلی کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ ان کے ہم عصروں میں کوئی ان جیسا کثیر الجہات اور پہلو دار ادیب نہیں تھا وہ بیک وقت مورخ، ادیب،نقاد، ترجمہ نگار،سوانح نگار اور سب کچھ تھے اور ہر موضوع پر دسترس رکھتے تھے۔

فارسی اور شعرالعجم کے حوالے سے پروفیسر شریف حسین قاسمی نے اپنے مقالہ میں کہا کہ علامہ شبلی کے کئی امتیازات ہیں ان میں سے ایک امتیاز یہ ہے کہ وہ پہلے ادیب ہیں جنہوں نے فارسی شعراور ادب کی تاریخ لکھی جبکہ یہ کام ایرانی ادب بھی نہیں کر پائے تھے۔ایرانی ادیبوں نے ان کے اس کارنامہ سے تحریک پاکر فارسی ادب کی تاریخ لکھی۔تاہم انہوں نے کہا کہ یہ افسوس کا مقام ہے کہ فارسی کے ادب کی تاریخ پر ہندوستان میں کام ہوا لیکن اس کا اعتراف ایرانی ادب میں کم ملتا ہے۔ پروفیسر قاسمی نے شعرالعجم کا تفصیل سے جائزہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ اس سے علامہ شبلی کی فارسی ادب پر دسترس آشکار ہوتی ہے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر ظفر احمد صدیقی نے تحقیق اور منسوبات کے موضوع پر اپنے مقالہ میں بتایا کہ علامہ شبلی نے بڑی دیدہ ریزی سے کئی اہم کتابوں کے اصل کا پتہ لگایا ان کا یہ

کارنامہ آج بھی بے مثال ہے۔ پروفیسر عامر حیات حسینی نے شبلی تفسیریات، اور علم الکلام کے موضوع پر اپنے وقیع مقالہ میں کہا کہ علامہ شبلی فلسفی نہیں تھے انہوں نے اپنے حالات، مزاج اور تبحر علمی کے مطابق سوالات اٹھائے اور ان کی تحلیل کی۔ وہ عالی تبحر اور عظیم دانشور ضرور تھے لیکن فلسفی نہیں لیکن ان کی جلائی ہوئی شمع ہمارے لئے مینارۂ نور ہے۔

محقق ڈاکٹر شمس بدایونی نے شبلی کے مراسلت اور خطوط پر مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ غالب کے بعد شبلی وہ مکتوب نگار ہیں جن کے خطوط میں وہ سب محاسن موجود ہیں جو قاری کے ذہن کو اپیل کرتے ہیں۔ پروفیسر شہاب الدین ثاقب نے اردو کی ترقی اور ترویج کے حوالے سے شبلی کی خدمات کا احاطہ کیا، بتایا کہ انجمن ترقی اردو کے وہ پہلے بانی سکریٹری مقرر کئے گئے۔ انہوں نے انجمن کو مضبوط بنیادوں پر کھڑا کرنے میں اہم رول ادا کیا۔ ان کے علاوہ جناب عبدالسلام اور جناب نظام الدین نے بھی مقالے پیش کئے۔

متین امروہی اور احمد علی برقی اعظمی نے اپنا کلام پیش کیا۔ سیمینار کی نظامت صحافی سہیل انجم نے انجام دی اور تعارفی کلمات ادا کرتے ہوئے غالب اکیڈمی کے سکریٹری ڈاکٹر عقیل احمد نے کہا کہ شبلی انیسویں اور بیسویں صدی کی ایک عبقری شخصیت اور ادیب تھے۔ اکیڈمی نے عظیم ادیبوں کے سو سال ہونے پر سیمینار منعقد کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور یہ اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

اس موقع پر بڑی میں لوگ موجود تھے جن میں ڈاکٹر عبدالعزیز، ڈاکٹر جی آر، کنول، نسیم عباسی، انجم عثمانی، مظہر محمود، سلیم دہلوی، منیر انجم، آرسی ورما ساحل، بابو رام ورما، فضل بن اخلاق انور علی قاسمی، جمشید جہاں، چشمہ فاروقی کے نام شامل ہیں۔

”جرمنی میں نصف صدی“ عارف نقوی کی کتاب پر گفتگو

غالب اکیڈمی بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی میں 15رنومبر 2014 کو شام چھ بجے ایک ادبی نشست کا اہتمام کیا گیا جس میں جرمنی کے مشہور ادیب جناب عارف نقوی کی کتاب ”جرمنی میں نصف صدی“ پر گفتگو ہوئی گئی، نریش ندیم، ڈاکٹر خالد علوی اور انجم عثمانی نے کتاب پر اظہار خیال کیا اس موقع پر مقامی شعرا نے اپنا کلام بھی سنایا۔

❁❁❁

کتابوں کی باتیں

کتاب کا نام: زریں نامہ
شاعرہ : ڈاکٹر عفت زریں
ناشر : شاہد پبلی کیشنز، نئی دہلی
اشاعت : 2014
قیمت : -/250

'بے ساحل دریا' سے ڈاکٹر عفت زریں نے اردو شاعری میں اپنا مقام اور اپنی شناخت بنالی ہے۔ ان کی شاعری پڑھی بھی جاتی ہے اور مشاعروں میں سنی بھی جاتی ہے۔ 1998 میں ان کا پہلا مجموعہ بے ساحل دریا شائع ہوا تھا اب سولہ سال بعد 2014 میں زریں نامہ منظر عام پر آیا ہے۔ عفت زریں کو شعر و شاعری کا ماحول گھر میں ہی مل گیا۔ ان کے والد مشیر جھنجھانوی دہلی کے مشہور و معروف استاد شاعر تھے۔ انھوں نے اپنی بیٹی کو اعلیٰ تعلیم دلائی۔ ڈاکٹر عفت زریں نے فورٹ ولیم کالج پر مقالہ لکھ کر دہلی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ان کی ایک اور کتاب لکھنو کا دبستان نثر ہے۔ اس کتاب کے پیش لفظ میں پروفیسر عتیق اللہ لکھتے ہیں:

> ''عفت زریں کی نثر اپنی بیشتر صورتوں میں بے لاگ مخاطبہ کا حکم ہی رکھتی ہے لیکن بنیادی طور پر شاعرہ ہونے کی باعث کہیں کوئی تشبیہی تلازمہ ان کی سیدھی سادی ادائیگی کا رخ موڑ دیتا ہے تو کہیں کوئی استعاراتی بندش ان کی عبارتوں میں شاعرانہ دلآویزی کا موجب بن جاتی ہے۔''

تشبیہ اور استعارہ شاعری کی جان ہے اور غزل کا شعری حسن ہے۔ ڈاکٹر عفت زریں الفاظ کو مختلف معنی میں اور مختلف طریقے پر استعمال کرنے کا فن جانتی ہیں۔ ان کی غزلوں میں لفظ دھوپ کا استعمال کثرت سے ہوا ہے۔ نمونے کے طور پر کچھ اشعار پیش خدمت ہیں۔

کھڑکیاں موم کی سورج کے مکاں ہیں زریں	دھوپ کے گھر میں بھلا سائے کہاں رہتے ہیں
دھوپ سایوں میں ڈھل ہی جائے گی	میرے پلکوں تک اس کو آنے دو
دھوپ میں بکھری پڑی تھیں روح کی پرچھائیاں	جگنو کو تیرے بن یہ رات کب اچھی لگی

شہر انا میں دھوپ نہ سایہ نہ گھر ملا منزل کوئی ملی نہ کوئی سنگ در ملا
جھونکے ہوا کے تھے جو سرگرداں تھے ہر طرف پت جھڑ میں دھوپ کی طرح لمس شجر ملا
دھوپ آنکھوں میں بھر نہ جائے کہیں تو نظر سے اتر نہ جائے کہیں
چلتی پھرتی تصویریں ہیں دھوپ ہے کیا اور سایہ کیا

دھوپ کہیں سختی کی علامت ہے تو کہیں وہ پلکوں سے ڈھل جاتی ہے۔ کہیں چکا چوند روشنی اور کہیں چلتی پھرتی تصویر ہے۔

عفت زریں نے اپنی ایک غزل میں ردیف کے طور پر دھوپ کا استعمال کیا جس میں دھوپ کو مختلف رنگ میں دکھایا ہے۔ دھوپ شرمیلی ہے۔ آنسو جیسی گیلی ہے سونے جیسی پیلی ہے۔ ڈگر جیسی پتھریلی ہے۔ موتی جیسی چمکیلی ہے۔

دھوپ کی طرح عفت زریں نے لفظ خواب کا بھی اپنے اشعار نیں خوب استعمال کیا ہے۔ زریں نامہ میں 130 غزلیں ہیں ان غزلوں میں خواب بکھرے ہوئے ہیں۔

کیا کیجئے اس لمس جنوں خیز کی باتیں بکھرے ہوئے کچھ خواب ہیں تعبیر کا منظر
بند کتابیں کھول کے دیکھو لفظ بھی رنگ بدلتے ہیں یادوں کی بے رنگ چتا میں خواب اکیلے جلتے ہیں
جس کو زریں خوابِ قفس کہہ سکیں دل کی دنیا خیالوں میں بستی رہی

عفت زریں نے خواب و خیال کو اپنی شاعری کا محور بنایا ہے وہ سماج جس میں انسان کی ضروریات پوری نہیں ہوتیں وہ ہر لمحہ ضروریات کو پوری کرنے کے لیے سرگرداں ہے اسے مایوسی و ناکامی زیادہ ملتی ہے۔ خواب و خیال کے رمز میں عفت زریں نے اپنے عہد کی سچائی کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ زندگی کو انھوں نے آگ کا دریا سے تعبیر کیا ہے۔

آج زریں کوئی بھی سہارا نہیں آرزو کی جگہ خودکشی رہ گئی
وہ کیسے آگ کے دریا کا سامنا کرتا اسے تو پار یہ سیل بلا اتار گیا

زریں نامہ میں غزلوں کے ساتھ 62 نظمیں بھی ہیں جن میں ان کے فکر و خیال زیادہ واضح طور پر سامنے آتے ہیں۔ وہ مہنگائی پر نظم لکھتی ہیں۔ کرب تنہائی پر نظم لکھتی ہیں۔ جینا مرنا کے عنوان سے نظم لکھتی ہیں، عورت، برہنہ جسم پر نظم لکھتی ہیں۔ برہنہ جسم ان کی ایک مختصر نظم ہے اس میں وہ لکھتی ہیں۔

ایک برہنہ جسم ننگی دھوپ میں

پیڑ کے سائے تلے کس نے
پھینکا
تا
کوئی وحشی گوشت خور چاٹ کر
اس کا لہو چلتا بنا
پر کوئی کہتا نہیں وہ کون ہے
کس سے اس کا کون سا رشتہ رہا
کیا
دیکھا کسی نے چہرہ کہیں
اس جسم کا

نظم سماج کے ایک حساس موضوع پر بہت سادگی سے لکھی گئی ہے۔ اسی طرح ان کی دوسری نظموں میں سماج کے بارے میں ان کے فکر وخیال کی عکاسی ملتی ہے۔

ان کی ایک کتاب بیسویں صدی میں اردو غزل ہے۔ غزل کے بارے میں اپنے خیال کا اظہار کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> ''غزل کو ہم اپنی تہذیبی شناخت کہتے ہیں۔ اس معنی میں ہمارے فکر ونظر کا آئینہ ہوتی ہے اور فکر ونظر کا رشتہ بیک وقت ماضی اور حال سے جڑا رہتا ہے۔ کون آدمی اسے کس سطح پر محسوس کر رہا ہے اور کس طرح اس کے بارے میں سوچتا ہے۔ کس اسلوب سے اس کا ذکر اس کے یہاں آتا ہے۔ اس کا سلسلہ انفرادی حسیت سے جڑا رہتا ہے اور اجتماعی حسیت اس کے سرچشمے کے طور پر کام آتی ہے۔

ڈاکٹر عفت غزل اور نظم دونوں کے فن سے واقف ہیں۔ غزل کہتی ہیں تو اس میں رمز وعلامت واشارات سے کام لیتی ہیں اور نظموں کو انھوں براہ راست اظہار کا وسیلہ بنایا ہے۔ زریں نامہ کے مطالعے سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر عفت زریں عہد حاضر کی ممتاز شاعرہ ہیں۔ ان کا کلام ذوق شعری کو تسکین بخشتا ہے۔

✪✪✪

کتاب کا نام: اقبال کا حرف شریں
مصنف : پروفیسر عبدالحق
ناشر : مصنف
قیمت : -/300 روپے
اشاعت : 2014

پروفیسر عبدالحق کا شمار ماہر اقبالیات میں ہوتا ہے۔ اقبال سے انھیں عشق ہے، تقریر ہو تحریر ہو یا نجی گفتگو وہ اقبال کے ذکر کے بغیر قدم آگے نہیں بڑھاتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی اقبال پر نصف درجن سے زیادہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب اقبال کا حرف شریں میں 14 مضامین اور اقبال پر لکھی گئی پانچ کتابوں پر تبصرے شامل ہیں جس میں اقبال کے فکروفن پر مختلف زاویوں سے روشنی ڈالی گئی ہے مثلاً اقبال صورت گر غزل، اقبال کے معاشی مقدمات، اقبال تعلیم وتربیت، اقبال مغربی ادب کے حوالے سے اقبال قومی وحدت کے تناظر میں، اقبال اور تحریک آزادی، اقبال اور شارحین، اقبال کے لفظ و معنی کا ثقافتی منظر نامہ اقبال کے ہم معنی فارسی و اردو اشعار، اقبال مصدر فیض، پروفیسر کلیم الدین احمد کی اقبال شناسی، پروفیسر رفیع الدین ہاشمی، قاضی محمد عدیل عباسی، اقبال صدی تقریبات: ایک جائزہ وغیرہ مضامین شامل ہیں۔ پہلے مضمون میں اقبال کی غزلیہ شاعری کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے پروفیسر عبدالحق لکھتے ہیں:

> "غزلوں میں تلمیحات وتاریخی کردار کے حوالے جس کثرت سے اقبال نے استعمال کیے ہیں اس کی نظیر کہیں اور نہیں ملتی۔ ان کے تذکرے سے صورت گری کے ان گنت نقوش ابھرتے ہیں۔ جہانِ گزراں کے واقعات اور ان سے وابستہ اشخاص کے سیکڑوں مرقع غزلوں میں آویزاں ہیں محسوس ہوتا ہے کہ اقبال کی شاعری تصویر خانہ ہے۔

مضمون میں اقبال کے اشعار سے مناسب مثالیں پیش کی گئی ہیں جس سے نفس مضمون کو سمجھنے میں بڑے آسانی پیدا ہو گئی ہے یہی اسلوب دیگر مضامین میں اپنایا گیا ہے۔ مثلاً دوسرے مضمون میں اقبال کی معاشی فکر کو ان کی نظموں کے حوالے سے پیش

کیا گیا ہے پہلی مثال اقبال کی نظم ہلال عید سے دی گئی ہے جس میں مفلسی کے ستم کو بیان کیا گیا ہے۔ اسی طرح اقبال اور تحریک آزادی ہند، میں اقبال کی شاعری کے حوالے سے تحریک آزادی کی ابتدائی کوششوں کو پیش کیا گیا ہے انھوں نے 1904 میں ہندوستانیوں کو بیدار کرنے کے لیے لکھا تھا۔

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

اقبال اور شارحین میں کلیات اقبال پر لکھی گئی شرحوں پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے خاص طور سے یوسف سلیم چشتی اور غلام رسول مہر کی شرح پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ دونوں شارحین سے پروفیسر عبدالحق مطمئن نہیں ہیں ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

''یوسف سلیم چشتی نے تکرار کے ساتھ اقبال کے فکر و پیغام کی اصل صورت کو بھی مسخ کر کے پیش کیا ہے۔ اشعار کے حوالے سے اپنے خام عقیدے اور نظریے کی دل کھول کر تبلیغ کی ہے۔ غلام رسول مہر نے بھی غیر سنجیدگی برتی ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ کسی کم سواد طالب علم نے یہ مطلب لکھے ہیں۔''

پروفیسر عبدالحق صاحب نے اپنے اس مضمون میں شرحوں کے علاوہ بعض کتابوں پر بھی تجزیاتی نظر ڈالی ہے جو اقبال پر لکھی گئی ہیں جو ہیں تو تنقیدی نوعیت کی لیکن ان میں کلام اقبال کی تشریح بھی ملتی ہے۔ اس مضمون میں اقبال پر لکھی گئی بہت سی کتابوں کی جانکاری مل جاتی ہے۔

کتاب کا ایک اہم مضمون اقبال کے لفظ و معنی کا ثقافتی منظر نامہ ہے۔ اس مضمون میں پروفیسر عبدالحق صاحب لکھتے ہیں:

'' لفظ و معنی کے رشتے کو نظام فکر سے جوڑ کر دیکھنے کی ضرورت ہے اقبال کی مجبوری تھی کہ مروجہ الفاظ کے بغیر ابلاغ ممکن نہ تھا انھیں ان لفظوں میں مفاہیم کی ترجمانی کے لیے توسیع کرنی پڑی انھوں نے عمومیت سے گزر کر لفظوں کو اصطلاحی صورت دی جنھیں ان کے متعلقہ تصورات کو ذہن میں

رکھ کر سمجھا جا سکتا ہے۔"

ظاہر ہے کہ اقبال فلسفے کے شاعر تھے وہ اپنے فکر اور پیغام کو دنیا کے سامنے خصوصاً ایشیا کے لوگوں کے سامنے پیش کرنا چاہتے تھے ان کے فلسفے اور فکر کو سمجھ کر ہی ان کی شاعری کو اور اس میں استعمال ہوئے الفاظ کو بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔ پروفیسر عبدالحق صاحب نے اپنے مضمون میں نظموں کے حوالے سے لفظ و معنی کا ثقافتی منظر نامہ پیش کیا ہے۔

اقبال کے ہم معنی فارسی و اردو و اشعار میں تفصیل سے اردو اور فارسی کے ان اشعار کا جائزہ لیا گیا جو معنوی اعتبار سے مماثل ہیں۔ اقبال مصدر فیض میں فیض کو ادبی اقدار کا شاعر بانکا و بالیدہ شاعر اس لیے قرار دیا گیا ہے کہ قدیم و جدید کا حسین ارتباط غالب و اقبال کے بعد فیض کے یہاں ملتا ہے۔ مضمون میں فیض کی بہت سی نظموں کے حوالے دیے گئے ہیں جن میں فیض کی اقبال سے مماثلت ملتی ہے۔ مضمون میں فیض کی بہت سی نظموں کے حوالے دیے گئے ہیں جن میں فیض و اقبال کی ذہنی و فکری قربت کا احساس ہوتا ہے۔ کلیم الدین احمد کی اقبال شناسی میں ان کی اقبال شناسی کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> "کلیم الدین احمد سخن فہم اور سخن شناس بھی تھے مگر غزل کے حامی یا حمایتی کم تھے طرف دار بھی تھے لیکن اقبال کی غزلوں نے جب تک ان سے اپنے حسب و نسب کو منوا نہیں لیا اپنی حریم میں داخل نہ ہونے دیا۔ یہ غزل کی نہیں اقبال کی شعری سرور آفریں ساحری تھی جس نے موصوف کے نشو نمائے غزل کی پرورش کی۔"

اگرچہ یہ کتاب اقبال پر مضامین کا مجموعہ ہے لیکن مضامین کا انتخاب اور ترتیب اس سلیقے سے کی گئی ہے کہ مسلسل اور مکمل کتاب کی صورت اختیار کر گئی ہے۔ یہ کتاب اقبالیات شناسی میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ ادب کے طالب علم کے لیے اس کو پڑھنا از حد ضروری ہے۔

❁❁❁

مطبوعات غالب اکیڈمی

نام کتاب	مصنف/مترجم	قیمت
دیوانِ غالب (ہندی)		100/-
دیوانِ غالب عام ایڈیشن	غالب اکیڈمی	100/-
یادگار غالب فارسی متن کے ترجمے	الطاف حسین حالی	450/-
دیوان غالب ڈیلکس		200/-
شرح دیوان غالب اردو	قاضی سعید الدین علیگ	300/-
غالب اور ہند مغل جمالیات	شکیل الرحمٰن	350/-
تفتہ اور غالب	ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری	35/-
شرح دیوان غالب (ہندی)	نسیم احمد عباسی	550/-
غالب اور فن تنقید	اخلاق حسین عارف	25/-
تصورات غالب	محمد عزیز حسن	35/-
انشائے مومن	پروفیسر ظہیر احمد صدیقی	25/-
مومن شخصیت اور فن	پروفیسر ظہیر احمد صدیقی	300/-
ہندوستانی رنگ	پروفیسر محمد حسن	75/-
نوائے سروش (انگریزی)	غالب اکیڈمی	40/-
اقبال/مضامین مقالات	پروفیسر اسلوب احمد انصاری	95/-
جنوب مغرب ایشیا میں رابطے کی زبان	پروفیسر محمد حسن	75/-
رقص شرر	ان میری شمل (قاضی افضال حسین)	90/-
غالب اور آہنگ غالب	یوسف حسین خاں	150/-
تلمیحات غالب	[illegible]	[illegible]
جہات غالب	ڈاکٹر عقیل احمد	200/-
حکیم عبدالحمید شخصیت اور خدمات	ڈاکٹر عقیل احمد	150/-
مطالعات خطوط غالب	حکیم عبدالحمید	150/-
مطالعات کلام غالب	حکیم عبدالحمید	600/-
نشاط غالب	وجاہت علی سندیلوی	150/-
اقبال اور عصر حاضر کا خرابہ	پروفیسر شمیم حنفی	150/-
مزار غالب (اردو)	شمس بدایونی	100/-
مزار غالب (ہندی)	شمس بدایونی	100/-
غالب اور اقبال کی متحرک جمالیات	یوسف حسین خاں	200/-
غالب اور منٹو	شمس الحق عثمانی	160/-